اسلام کا پیغام انسانیت کے نام

مرتّب

حضرت مولانا محمّد عرفان ثاقب صاحب قاسمی

بانی و مہتمم جامعۃ السعادۃ و جامعہ اسعاد البنات
قصبہ کیرانہ، ضلع شاملی، یوپی

ناشر

تحقیقات شرعیہ اکیڈمی

محلہ ابراہیم پورہ (آل کلاں) شاملی روڈ، کیرانہ
ضلع شاملی، یوپی، انڈیا۔ پن کوڈ: ۲۴۷۷۷۴

اسلام کا پیغام انسانیت کے نام

مرتب

حضرت مولانا محمد عرفان ثاقب صاحب قاسمی
بانی ومہتمم جامعۃ السعادۃ وجامعہ اسعاد البنات
قصبہ کیرانہ، ضلع شاملی، یوپی

ناشر
تحقیقات شرعیہ اکیڈمی
کیرانہ شاملی، یوپی، انڈیا

تفصیلات

نام کتاب	:	اسلام کا پیغام
مرتب	:	حضرت مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی
اشاعت	:	شوال المکرم ۱۴۴۵ھ-اپریل ۲۰۲۴ء
تعداد	:	گیارہ سو
طباعت	:	مکتبہ النور دیوبند
ناشر	:	تحقیقات شرعیہ اکیڈمی، کیرانہ

ناشر

تحقیقات شرعیہ اکیڈمی

کیرانہ شاملی، یوپی، انڈیا

فہرست مضامین

ابتدائیہ

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم امابعد!

جامعۃ السعادہ کیرانہ کے علمی، اصلاحی اور تحقیقی ترجمان ''ماہ نامہ تحقیقاتِ اسلامی'' کے کالم ''پیغامِ انسانیت'' میں ہر ماہ اصلاحی وفکری مضمون لکھنے کا معمول رہا ہے جسے اہل علم نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور کتابی شکل میں اشاعت کی خواہش ظاہر کی۔

''اسلام کا پیغام انسانیت کے نام'' انہی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جسے ''تحقیقات شرعیہ اکیڈمی کیرانہ'' شائع کر رہی ہے۔

دعا ہے کہ رب کریم اسے قبول فرمائے اور میرے لئے ذریعۂ آخرت بنائے۔

محمد عرفان ثاقب قاسمی
جامعۃ السعادہ کیرانہ، شاملی، یوپی
۴ر ذی قعدہ ۱۴۴۵ھ
۱۳ر مئی ۲۰۲۴ء

قرآن حکیم اور ہماری ذمہ داریاں

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے گھروں میں ایک ایسی کتاب ہے جس کا بہت احترام کیا جاتا ہے، اُس کتاب کو ہم عمدہ غلاف میں لپیٹ کر گھر میں کسی اونچی جگہ پر رکھتے ہیں کہ اس کی بے ادبی نہ ہو، کبھی کبھی گھر کا کوئی بزرگ اسے کھول کر بہت اہتمام سے باوضو ہو کر پڑھ بھی لیتا ہے، خاص طور پر بعض دینی گھرانوں میں گھر کے سب افراد باقاعدگی سے اسے پڑھتے ہیں اور بچوں کو بھی اس کی تعلیم دینے کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن آج کل اکثر گھروں میں اس کتاب کو پڑھنے کا کوئی اہتمام نظر نہیں آتا اور اسے محض ایک مقدس کتاب کے طور پر گھر میں کسی اونچی جگہ رکھ دیا جاتا ہے۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جس کتاب کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ قرآنِ مجید ہے، یہ قرآن اس اللہ کا کلام ہے جو زمین و آسمان کا خالق و مالک اور ہمارا رب ہے، اور یوں تو ہم پر اللہ تعالیٰ کے احسانات اس قدر ہیں کہ ہم زندگی بھر اس کا شکر ادا کرتے رہیں، تب بھی وہ ان احسانات کا بدل نہیں ہوسکتا، لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ اللہ کا سب سے بڑا احسان کون سا ہے، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا ہے کہ اس کائنات میں انسانوں پر اللہ کا سب سے بڑا انعام اور سب سے عظیم احسان یہ ہے کہ اس نے انسان کو اپنا کلام یعنی قرآن مجید عطا فرمایا ہے، اس لیے کہ قرآن مجید وہ نعمت ہے کہ اگر ہم اس سے وابستہ رہتے ہیں تو ہماری دنیا بھی سدھر جاتی ہے اور آخرت بھی سنور جاتی ہے۔

غور کیجئے! اگر کسی شخص کے ہاتھ کوئی ایسا نسخہ آجائے کہ جس کی بدولت اسے دنیا میں بھی عزت و کامرانی حاصل ہو اور آخرت میں بھی کامیابی کی ضمانت مل جائے تو کیا ایسے شخص کے لیے وہ نسخہ ہی عظیم ترین دولت نہ ہوگا، اب ہم مسلمانوں کی بدقسمتی دیکھئے کہ ہمارے پاس وہ نسخۂ ہدایت موجود ہے جو ہمیں دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضمانت دیتا ہے، لیکن ہم

اس کی عظمت سے ناواقف ہیں، ہماری مثال اس فقیر کی سی ہے جس کے کشکول میں ہیرا موجود ہو، لیکن وہ اپنی نادانی میں اسے کانچ کا ٹکڑا سمجھ کر دوسروں سے بھیک مانگتا پھرتا ہو۔

چناں چہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے تو قرآن کی قدر و قیمت کا شعور حاصل کریں، قرآن کی عظمت کی شان تو یہ ہے کہ اس قرآن سے جو شخص بھی وابستہ ہوگا وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک فرمان کے مطابق تمام انسانوں میں بہترین قرار پائے گا اور جو قوم قرآن کو مضبوطی سے تھامتی ہے، اسے اس دنیا میں ہی عروج عطا کر دیا جاتا ہے، گویا قرآن تو وہ نسخہ کیمیا ہے جو قوموں کی تقدیر بدلنے کی قوت رکھتا ہے، بقول مولانا حالیؔ ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا ☆ اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

لیکن یہ جان لیجئے کہ اگر اللہ نے ہم پر اتنا بڑا احسان فرمایا ہے کہ قرآن جیسی عظیم دولت ہمیں عطا فرمائی ہے تو ہمارا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ ہم اس احسان پر اللہ کا بھرپور انداز میں شکر ادا کریں۔

لیکن اللہ کا شکر ہم کس انداز میں ادا کریں؟ اسے ایک مثال سے سمجھئے! دیکھئے اگر کسی سعادت مند لڑکے کو اُس کے والد کوئی اچھی سی کتاب تحفے کے طور پر دیں، تو سوچئے کہ اس کا طرزِ عمل کیا ہوگا، وہ بچہ سب سے پہلے تو زبان سے اپنے والد کا شکریہ ادا کرے گا، پھر شکر و احسان مندی کے جذبات کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کرے گا اور پھر اس کتاب کے مطالعے سے جو اچھی باتیں اسے سمجھ میں آئیں گی اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے گا، دراصل اسی طرح کا طرزِ عمل ہمارا قرآن کے ساتھ بھی ہونا چاہئے۔ یعنی یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم: ۱-اس قرآن پر ایمان لائیں۔ ۲-اس کی تلاوت کریں۔ ۳-اس کو سمجھیں اور اس پر غور و فکر کریں۔ ۴-اس پر عمل کریں۔ ۵-اور اسے دوسروں تک پہنچائیں۔

اگر ہم قرآنِ مجید کے ان حقوق کو ادا کریں گے تو دنیا اور آخرت کی کامیابیاں ہمارے حصے میں آئیں گی لیکن اگر ہم نے ان ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا تو یہی قرآن اللہ کی عدالت میں ہمارے خلاف بطور دلیل پیش ہوگا، تو آیئے ان حقوق کو تفصیل میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

پہلا حق: قرآن پر ایمان لایا جائے

یہ بات بظاہر عجیب سی معلوم ہوگی کہ مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ قرآنِ مجید پر ایمان لایا جائے، حالاں کہ قرآن مجید پر ایمان لائے بغیر کوئی مسلمان کہلا ہی نہیں سکتا، لیکن یہ بات آپ آسانی سے سمجھ جائیں گے، اگر اس حقیقت کو ذہن میں رکھیں کہ ایمان کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک زبان سے اقرار کرنا اور دوسرا ہے دل سے تصدیق کرنا اور ایمان مکمل تبھی ہوتا ہے جب زبانی اقرار کے ساتھ دل کا یقین بھی انسان کو حاصل ہو جائے۔ اس لیے کہ جس چیز پر ہمارا یقین ہو ہمارا عمل اس کے خلاف نہیں جاسکتا، آپ کو معلوم ہے کہ آگ جلاتی ہے اس لیے کوئی شخص آگ میں انگلی نہیں ڈال سکتا، بلکہ ہمارا تو یہ طرز عمل ہے کہ جس چیز پر ہمیں شک ہو ہم اس کے بارے میں بھی محتاط ہوجاتے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے سانپ زہریلے نہیں ہوتے لیکن ہم پھر بھی کبھی کسی بھی سانپ کو پکڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہمیں قرآن مجید پر کامل یقین ہے لیکن ہمارا طرز عمل اس کے خلاف ہے، اس لیے کہ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم نہ تو اس کی تلاوت باقاعدگی سے کرتے ہیں اور نہ اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے احکامات پر عمل کرتے ہیں، اس لیے ثابت ہوا کہ دراصل ہمارا ایمان کمزور ہے، ہم زبان سے تو اقرار کرتے ہیں کہ یہ اللہ رب العزت کا کلام ہے لیکن یقین کی دولت سے ہم محروم ہیں، ورنہ جسے یقین حاصل ہوجائے اس کا تو اوڑھنا بچھونا ہی قرآن بن جاتا ہے، صحابہ کرامؓ کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ انہیں قرآن سے کس درجہ محبت تھی، جیسے ہی قرآن کی آیات نازل ہوتیں ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ انہیں جلد از جلد یاد کرلیں، پوچھا جاسکتا ہے کہ اس کمی کو کیسے پورا کیا جائے، اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا بس ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ خود قرآن مجید ہے، بقول مولانا ظفر علی مرحوم ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکان فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی قاری کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

جب ہمیں یقین ہوجائے گا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور ہماری ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے تو پھر اس کے ساتھ ہمارے تعلق میں ایک انقلاب آجائے گا، پھر ہمیں محسوس ہوگا کہ اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے قرآن سے بڑھ کر کوئی دولت اور اس سے عظیم تر کوئی نعمت نہیں ہے۔

دوسرا حق: قرآن کی تلاوت کی جائے

ہم مسلمانوں پر قرآن حکیم کا دوسرا حق یہ ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کریں، اس لیے کہ کسی اچھی کتاب کو نہ پڑھنا بڑی ناقدری کی بات ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب الٰہی کے اصل قدردانوں کی کیفیت قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے:

''اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتَابَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ''

یعنی جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں، جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم قرآن مجید کا حق تلاوت ادا کرسکیں۔ (آمین)

اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ جاننا ہے کہ قرآن حکیم کی بار بار تلاوت کیوں ضروری ہے، یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے یہاں تک کہ فرشتوں نے بھی اسے سجدہ کیا تھا اور اس کی برتری کو تسلیم کیا تھا۔لیکن اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کی تخلیق میں جہاں مٹی اور گارا شامل ہے وہیں روحِ ربانی بھی اس میں پھونکی گئی ہے۔ گویا اس اشرف المخلوقات یعنی انسان کی تخلیق کے دو حصے ہیں، ایک اس کا گوشت پوست کا جسد ہے جو مٹی سے بنا ہے اور دوسرا حصہ اس روح پر مشتمل ہے جس کی نسبت خود اللہ نے اپنی ذات کی طرف فرمائی ہے۔ اس گوشت پوست والے حصے کی تمام تر ضروریات زمینی وسائل ہی سے پوری ہوتی ہیں، ہم جو کچھ کھاتے ہیں وہ اسی زمین سے حاصل ہوتی ہیں اور ہمارے مکانات تو مٹی گارے ہی سے تیار ہوتے ہیں، لیکن روح کا تعلق چوں کہ اس زمین سے نہیں بلکہ عالم ملکوت سے ہے،

لہٰذا اس کی غذا بھی زمین سے حاصل نہیں ہوتی، وحیٔ الٰہی کی شکل میں آسمانوں سے آتی ہے، اس اعتبار سے قرآن حکیم دراصل ہماری روح کے لیے غذا کا کام دیتا ہے اور اس کی تلاوت روح کی نشوونما اور اسے تروتازہ رکھنے کا اہم ذریعہ ہے، اب یہ بات واضح ہوگئی کہ جس طرح ہم اپنے جسم کو صحت منداور توانا رکھنے کے لیے مسلسل محنت کرتے ہیں اور اچھی سے اچھی غذا کا اہتمام کرتے ہیں، اسی طرح اپنی روح کو تروتازہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم بار بار قرآن حکیم کی تلاوت کیا کریں، اور اسے اچھے سے اچھے انداز میں پڑھنے کی کوشش کریں، تلاوتِ قرآن کا حق ادا کرنے کے لیے درج ذیل باتوں کا اہتمام ضروری ہے۔

تجوید:

قرآن مجید کی درست تلاوت کے لیے تجوید کا سیکھنا بہت ضروری ہے، تجوید سے مراد ہے عربی حروف کی پہچان، ان کی صحیح ادائیگی اور قرأت کے بنیادی اصولوں سے واقفیت حاصل کرنا، تجوید کا جاننا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر قرآن کی صحیح تلاوت ممکن نہیں، بلکہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں قرآن کے معنوں میں ردّ و بدل نہ ہوجائے۔ مثلاً ''قُل'' کا مطلب ہے ''کہو'' لیکن اگر اسے ''کُل'' پڑھ دیا جائے تو اس کا مطلب ہوجائے گا ''کھاؤ''۔ اسی طرح ''اَنعمتَ'' کا مطلب ہے ''تو نے انعام کیا'' لیکن اگر اسے ''انعمتُ'' پڑھ دیا جائے تو اس کا مطلب ہوجائے گا ''میں نے انعام کیا'' آپ نے دیکھا کہ زبر اور پیش کی معمولی سی غلطی سے مفہوم میں کتنا فرق واقع ہوگیا، ثابت ہوا کہ تجوید کا سیکھنا تلاوت کی بنیادی شرط ہے۔

باطنی وظاہری آداب:

قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے چند آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ جن میں سے بعض ظاہری نوعیت کے آداب ہیں اور بعض کا تعلق انسان کے باطن سے ہے۔ ظاہری آداب میں باوضو ہونا، لباس کا پاک ہونا اور قبلہ رو ہو کر باادب بیٹھنا شامل ہیں۔ اسی طرح آدابِ تلاوت میں سے یہ بھی ہے کہ تلاوت کی ابتدا ''اعوذ باللہ من الشیطٰن

الرجیم ''اور''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' سے کی جائے۔ باطنی نوعیت کے آداب یہ ہیں کہ دل میں اللہ اور اس کے کلام کی عظمت کا احساس ہو، اور اللہ تعالیٰ کے محاسبے کا خوف اور اس کی محبت کا جذبہ دل میں پیدا کرنے کی نیت ہو۔ اسی طرح تلاوت ہمیشہ ہدایت حاصل کرنے کی نیت سے کرنی چاہئے اور دل میں یہ ارادہ ہونا چاہئے کہ جو کچھ سمجھ میں آیا اس پر عمل کروں گا، اور قرآن کے تقاضوں کے مطابق اپنی زندگی کے رُخ کو موڑ دوں گا۔

روزانہ کا معمول:

قرآن حکیم کی تلاوت کا حق ادا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تلاوت کو باقاعدہ اپنے روزانہ کے معمولات میں شامل کیا جائے۔ روزانہ کتنی تلاوت کی جائے اس میں کمی بیشی کی کافی گنجائش موجود ہے۔ اور مختلف لوگوں کے لیے اس کی تعداد مختلف ہوسکتی ہے، لیکن تین دن سے کم کی مدت میں قرآن مجید کی تلاوت کی تکمیل درست نہیں ہے۔ یعنی روزانہ دس سیپاروں سے زیادہ تلاوت کرنا حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق مناسب نہیں ہے۔ تاہم روزانہ کم سے کم ایک پارہ ضرور پڑھنا چاہئے تاکہ ایک ماہ میں قرآن حکیم کی تلاوت مکمل ہوجائے۔ صحابہ کرامؓ کا معمول یہ تھا کہ روزانہ ایک حزب کی تلاوت کر کے سات دن میں قرآن مجید مکمل کرلیا کرتے تھے اور یہ بات تو آپ کو معلوم ہوگی کہ قرآن مجید میں کل سات احزاب ہیں اور ہر حزب تقریباً ساڑے چار پاروں پر مشتمل ہوتا ہے، جس کی تلاوت انتہائی سکون اور آرام سے دو گھنٹوں میں کی جاسکتی ہے۔

خوش الحانی:

اللہ کے رسول ﷺ نے تاکیداً فرمایا ہے کہ ''زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ'' یعنی قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کرو اور اس معاملہ میں کوتاہی پر بڑے سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی ہے۔ ''مَن لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ فَلَيْسَ مِنَّا'' یعنی جو شخص قرآن کو خوش الحانی سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں ہے، اس لیے ہمیں اپنی کوشش کی حد تک قرآن کو بہتر سے بہتر انداز میں اور اچھی سے اچھی آواز سے پڑھنا چاہئے۔

ترتیل:

قرآن کی تلاوت کا حق ادا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اسے ترتیل کے انداز میں پڑھیں، ترتیل کا مطلب ہے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا، یعنی قرآن کی ہر آیت پر رکتے ہوئے اس کے معنی اور مفہوم کو سمجھتے ہوئے اور اس کے اثرات کو دل میں سموتے ہوئے پڑھا جائے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شروع ہی میں یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ:

يَآَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝

یعنی ''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رات کو (اپنے رب کے سامنے) کھڑے ہوا کرو............اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔'' علامہ اقبال نے رات کے قیام کی کتنے خوب صورت انداز میں ترغیب دلائی ہے۔

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

حفظ:

قرآن کی تلاوت ہی کا ایک گوشہ حفظ قرآن بھی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حفظ قرآن پورے کے پورے قرآن کو زبانی یاد کر لینے کا نام ہے اور یہ کام کسی خاص طبقے کے لوگوں کے کرنے کا ہے، ظاہر ہے کہ یہ خیال درست نہیں، بلکہ حفظ قرآن سے مراد یہ ہے کہ ہر مسلمان زیادہ سے زیادہ قرآن کو یاد کرنے کی کوشش کرتا رہے، تاکہ وہ اس قابل ہو سکے کہ نفل نمازوں میں اور خاص طور پر تہجد کی نماز میں زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھ سکے، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول یہی تھا کہ آپ تہجد کی نماز میں طویل قرأت کیا کرتے تھے، بعض اوقات ایک ایک رکعت میں کئی کئی پاروں کی تلاوت فرمایا کرتے تھے، لہٰذا ہم میں سے ہر شخص کو کوشش کرنی چاہئے کہ وہ قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور یاد کرے اور قرآن مجید کے آخری تین چار پارے تو ہم میں سے ہر شخص کو یاد ہونے چاہئیں، اس لیے کہ آخری پاروں میں سورتیں زیادہ طویل نہیں ہیں اور عام طور پر نمازوں میں انہی کو پڑھا جاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص پورے قرآن کو حفظ کرنے کا اہتمام کرتا ہے تو یقیناً اس کے لیے بہت بڑا اجر ہے جس کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث میں موجود ہے۔

اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

القرآن کتاب الہدیٰ والتقیٰ، کلام خدا، پیغامِ الٰہی، راہِ عمل، راہ نجات، درسِ موعظت، درسِ عبرت، ایسا فصیح وبلیغ کہ دنیا اس کی نظیر ومثیل لانے سے قاصر، ایسا کامل واکمل کہ نہ اس جیسا پہلے آیا اور نہ قیامت تک آئے گا، لوحِ محفوظ سے اتارا گیا، روح الامین لے کر اترے، قلبِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اترا، خیر امت کے لیے اتارا گیا، اترا کب؟ جی یہی (ماہ رمضان ہی) وہ ماہ مبارک ہے جس میں اترا، جو اس وقت رحمتوں کا خزانہ لیے، غفلتوں کے پردوں کو وا کیے اور عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے آپ پر سایہ فگن ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ۚ. (البقرۃ:۱۸۵)

(مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن، ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی)

بے دار ہو جایئے، پائینچے چڑھا لیجیے، کمر کس لیجیے، روزہ رکھئے، نماز پڑھیے، صدقہ و خیرات کیجیے، قرآن کی تلاوت کیجیے، وہ قرآن جو تیری ہی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا، تیرے ہی لیے دستورِ حیات بن کر آیا اور دنیا وآخرت میں تیری ہی کامیابی وکامرانی کا دعویدار ہے، اس کا ایک ایک قانون تجھے عظمتیں عطا کرے گا، اس کا ایک ایک پیغام تجھے جنت کے راستے پر چلائے گا، اس کا ایک ایک حرف تجھے دس دس نیکیوں کا حق دار بنائے گا، اس لیے سمجھ میں نہ آئے تب بھی پڑھ اور سمجھ کر پڑھے تو نور علیٰ نور۔

یہی وہ قرآن ہے جس نے آج سے چودہ سو سال پہلے کفر وشرک میں ڈوبی، ظلم و طغیانی کی عادی، قتل وخون ریزی کی خوگر، مے نوشی وعیش کوشی میں مبتلا انسانیت کو شاہ راہِ

ترقی پر گامزن کیا، عظمتوں کے چار چاند لگائے، حقوقِ انسانی کا فلسفہ دیا، اخوت و مساوات کا درس دیا، تہذیب وتمدن سے آشنا کیا، ہر انسان کو جینے کا حق دیا، بندے کو اس کے خالق سے ملایا، اس کے اندر احساسِ جوابدہی پیدا کیا، اور دنیا کو جو کہ جہنم کا نمونہ پیش کررہی تھی گہوارۂ امن وآشتی بنادیا۔

اے غافل انسان! آج تو غیروں میں راہِ نجات تلاش کررہا ہے، غیروں کی تہذیب وتمدن کو اپنارہا، اور قرآن جیسی کتابِ ہدایت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ قرآن سے اپنے رشتے کو تقریباً ختم کردیا ہے۔ صبح قرآن نہیں پڑھتا، اخبار پڑھتا ہے، قرآن سے ہدایت نہیں حاصل کرتا، ٹی وی وانٹرنیٹ کے ذریعہ راہِ ترقی تلاش کرتا ہے، اپنے بچوں کو قرآن کی تعلیمات سے واقف نہیں کراتا، انھیں جغرافیہ اور سائنس کے چکر میں پھنساتا ہے، خدا کی قسم! تو کبھی ترقی نہیں کرسکتا، عظمتیں حاصل نہیں کرسکتا، متحد ومتفق نہیں ہوسکتا، جب تک قرآن کی تعلیمات پر عمل نہیں کرے گا، قرآن کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے گا نہیں:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا. (آل عمران: ۱۰۳)

(اور مضبوط پکڑو رسّی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو۔)

آیئے ماہ رمضان کو کارآمد بنایئے، غفلتوں کے پردوں کو چاک کیجیے، قرآن سے اپنے رشتے کو مضبوط کیجیے، اس کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کیجیے، اس کے احکامات کو اپنی زندگی پر نافذ کیجیے، معاشرے کی، پاس پڑوس کی اور اہل خانہ کی خبر لیجیے، غافلوں کو بیدار کیجیے، امن کے پیغام کو عام کیجیے، برادرانِ وطن میں اس کے حوالے سے در آنے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کیجیے۔ جنہیں قرآن نہ پڑھنا آتا ہو، ان کی تعلیم کا نظم کیجیے، اپنے محلے کی مسجد میں تفسیر قرآن کا اہتمام کیجیے۔ قرآن کے نام پر امت کو متحد ومتفق کرنے کی تگ ودو کیجیے۔ جو لوگ اس کارِ خیر میں لگے ہوئے ہیں بڑھ چڑھ کر ان کا تعاون کیجیے، اور اپنے آقا ومولیٰ کی خوشنودی حاصل کیجیے۔

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہوکر اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

زیورِ علم سے بچوں کو آراستہ کیجیے

علم وہ خزانہ ہے جو ایمان کو جلا بخشتا ہے، دل ودماغ کو قوت دیتا ہے، نجات اور ترقی کی راہوں کو کشادہ کرتا ہے، جنھوں نے علم کو اپنے سینے سے لگایا، اپنی اولادوں کو زیورِ علم سے آراستہ کیا، ماضی سے عبرت حاصل کی، حال کو سنوارا اور علم کی روشنی میں مستقبل کی فکر کی وہی کامیاب وکامران رہیں، اور ترقی حاصل کرسکیں۔ ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں کا شمار تہذیب وتمدن اور علم وآگہی کے اعتبار سے دنیا کی اعلیٰ ترین قوموں میں تھا، لوگ ان کے لباس پر فخر کرتے تھے، ان کی تہذیب کو اپنانے کی کوشش کرتے تھے، ان کی زبان اعلیٰ، ان کا کلچر ماڈرن سمجھا جاتا تھا اور ان کے علم وفہم پر اعتماد کیا جاتا تھا۔

لیکن جب سے یہ قوم، علم اور فکر وآگہی سے اپنے رشتے کو توڑ کر، لہو ولعب میں مشغول ہوگئی، عیش وعشرت کی زندگی کو حصولِ علم کی دشوار گذار راہوں کے مقابلے میں ترجیح دینے لگی۔ اپنے بچوں بلکہ نسلوں کی تعلیم وتربیت کی فکر سے آزاد ہوکر خوابِ خرگوش میں مست ہوگئی تو انجام یہ ہوا کہ اس سے زیادہ ذلیل، کمتر اور بے حیثیت کوئی قوم من حیث القوم نہ رہ گئی۔ ایسا کیوں نہ ہو۔ خالق ارض وسماء ربّ انس وجان کا خود ارشاد ہے:

قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِي الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۔ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ. (زمر:۹)

(اے پیغمبر!) آپ کہیے کہ علم والے اور جہل والے (کہیں) برابر ہوتے ہیں؟ (بہر حال) وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہل عقل ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم جو سب سے پہلا پیغام لے کر نوعِ انسانی کے نام اترا وہ حصولِ علم ہی کی ترغیب تھی: ''اقرأ'' (پڑھ تو)۔ اے مسلمانوں اگر ترقی چاہتے ہو، اپنی

غربت اور مفلسی کو دور کرنا چاہتے ہو، معاشرے میں عزت و وقار حاصل کرنا چاہتے ہو، خدا کی خوشنودی حاصل کرکے آخرت میں نجات چاہتے ہو، تو علم سے اپنے رشتے کو مضبوط کرلو، اپنے بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلانے کی جدوجہد کرو، بھوکے پیاسے رہنا زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے، لیکن اگر آپ کا بچہ علم سے محروم رہ گیا تو یہ بہت بڑا خسارہ ہوگا۔ ساتھ ہی اپنے پاس پڑوس اور محلے کے ان غریب خاندان کے بچوں کی بھی فکر کیجیے جن کے والدین غربت یا جہالت کی وجہ سے اپنے بچوں کو مزدوری میں لگائے ہوئے ہیں، یا بےفکری کی وجہ سے بچے محلے کی گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرتے اور گلی ڈنڈا کھیلتے نظر آتے ہیں۔ ان کے والدین اور سرپرستوں کو متوجہ کیجیے کہ وہ اپنے بچوں کو کسی مدرسے میں داخل کرائیں اور ان کی تعلیم کا بندوبست کریں، اگر والدین اخراجات کی شکایت کریں تو آپ ہمت کیجیے، قدم آگے بڑھائیے، اگر اللہ ربّ العزت نے مال و دولت سے آپ کو وافر حصہ دیا ہے تو اخراجات کی ذمہ داری اپنے اوپر لیجیے۔ ورنہ محلے والوں کو جمع کیجیے، کمیٹی بنائیے اور لوگوں سے اپیل کیجیے کہ پورا محلّہ مل کر محلّے کے ہر بچے کی تعلیم کا نظم کرے اور اپنی گاڑھی کمائی سے ان بچوں کی تعلیم میں مدد کرے، جن کے والدین غربت کی وجہ سے انتظام نہیں کرسکتے۔

اس وقت سب سے بڑا اور اہم کام مسلمانوں کا یہی ہے کہ وہ تعلیم کی جانب متوجہ ہوں، یہ ایسا صدقہ جاریہ ہوگا جس کا ثواب اور فائدہ زندگی میں بھی آپ کو ملے گا اور وفات کے بعد بھی اجر کے آپ مستحق ہوں گے۔

مدارسِ اسلامیہ جنھوں نے غریب و نادار مسلم بچوں و بچیوں کی تعلیم و تربیت کا عمدہ نظم کررکھا ہے، یہی نہیں کہ وہ رہنے سہنے کا انتظام کرتے ہیں، بلکہ کھانے پینے اور فوری علاج کی بھی ذمہ داری لیتے ہیں۔ اپنے بچوں کو ان مدرسوں میں داخل کیجیے، یہ مدارس ان کی دنیا بھی سنواریں گے اور آخرت بھی۔ یہ ایسا علم سکھائیں گے جس سے بچہ آپ کو، اپنے اہل خانہ کو اور سب سے بڑھ کر اپنے خدا اور رسول کو پہچانے گا، ان کی اطاعت کرے

گا، آپ کی خدمت کو سعادت سمجھے گا۔ معاشرے میں پھیلی برائیوں اور بے حیائیوں کی اصلاح کا ذریعہ بنے گا۔

وہ علم چنداں مفید نہیں جو آخرت کو فراموش کرادے، خدا سے انسان کے رشتے کو توڑ دے، گمراہی و ضلالت کی اندھیریوں میں لے جا کر گرادے۔ احسان فراموشی، والدین کی خدمت سے دوری، مفاد پرستی جس سے پیدا ہو اور جو صرف دنیا تو سنوار دے لیکن آخرت کی ہلاکت سے نہ بچا سکے۔ آپ اپنے بچوں کو اس علم کے زیور سے آراستہ کیجیے، جو اس کے اخلاق و کردار کو سنوارے، خدمتِ خلق کا جذبہ ابھارے، اللہ اور اس کے رسول سے اس کے رشتے کو مضبوط کرے، اور دنیا وآخرت دونوں کو سنوار دے۔

واضح رہے کہ اسلام عصری علوم کا مخالف نہیں ہے، شوق سے عصری علوم پڑھائیے، ڈاکٹر، انجینئر اور سائنس داں بنائیے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ عصری تعلیم دیجیے، لیکن اسلام کو، اسلامی تعلیمات کو اور قرآن وحدیث کو پس پشت ڈال کر نہیں، آخرت کو فراموش کر کے نہیں۔ اس لیے اگر آپ مدارس کی بجائے اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل کرنا چاہتے ہیں، تو داخل کیجیے، لیکن ساتھ ہی اس کی دینی تعلیم کا بھی نظم ضرور کیجیے، قرآن پڑھوائیے، اسلام کے بنیادی عقائد سے اسے واقف کرائیے، حلال وحرام کی شناخت کرائیے، بنیادی اور اہم مسائل کی تعلیم دلوائیے، خوفِ آخرت اس کے اندر پیدا کیجیے، اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس کے دل میں جاگزیں کیجیے، تاکہ اس کی آخرت نہ برباد ہو، اور جہنم کا ایندھن نہ بنے۔ ارشادِ باری ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ، اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ .

(اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔)

طالبانِ علومِ نبوت کے ساتھ حسن سلوک کیجئے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف پیرائے اور طریقوں سے امت کو حصول علم دین کی ترغیب دی، طالب علم کے فضائل بیان فرمائے، حصول علم کی راہ میں جو مصائب ومشکلات پیش آتی ہیں ان پر صبر کی تلقین فرمائی، اس راہ کو راہ جہاد قرار دیتے ہوئے جنت کی بشارت دی اور اس راہ کی موت کو موت شہادت بتلایا۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو مشفق ومہربان والدین، بہن بھائی اور اقرباء کی فرقت، غربت، مسافرت، فاقہ کشی اور بدحالی کو سرمایۂ سعادت سمجھتے ہوئے حصول علم کے لیے دور دراز کی منزلیں طے کرتے ہیں، در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں اور علوم نبوت کے لعل وجواہر سے اپنے دامن کو بھرتے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں اس خوش نصیب جماعت کے فضائل ومراتب زبان رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ میں:

"ان العلماء هم ورثة الانبياء ورثوا العلم من اخذه اخذبحظ وافر ومن سلك طريقاً يطلب به علماً سهل الله له طريقاً الى الجنة".

(بخاری: ۱/۱۶)

(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں اور ان کا ورثہ علم ہے، پس جس نے دین کا علم حاصل کیا اس نے پورا حصہ حاصل کیا اور جو شخص اس راستے پر چلے کہ جس کے ذریعے وہ علم کا متلاشی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کے راستے کو آسان کردے گا۔)

"قال ابو الدرداء فانی سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من سلك طريقاً يبتغى فيه علماً سلك الله به طريقاً الى الجنة وان الملائكة لتضع اجنحتها رضئ لطالب العلم وان العالم ليستغفر له

من فی السمٰوٰت و من فی الارض حتی الحیتان فی الماء".

(ترمذی: ۹۷/۲)

(حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے راہ مسافرت اختیار کرتا ہے تو اس شخص کو اللہ تعالیٰ جنت کے راستہ پر چلائے گا اور اس طالب علم کی خوشنودی کے لیے فرشتے اپنے پر بچھا دیتے ہیں، بلاشبہ عالم دین کے لیے آسمان و زمین کی ساری مخلوقات یہاں تک کہ پانی کی مچھلیاں دعائے مغفرت کرتی ہیں۔)

"عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ ﷺ من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتی یرجع". (ترمذی: ۹۳/۲)

(حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص علم دین کی طلب و تحصیل میں نکلا تو جب تک وہ واپس نہ آجائے گا اللہ کی راہ میں ہے۔)

"عن سخبرة عن النبی صلی اللہ علیہ و سلم قال من طلب العلم کان کفارة لما مضی". (ترمذی: ۹۳/۲)

(حضرت سخبرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے علم دین حاصل کیا، تو اس کا یہ علم دین حاصل کرنا اس کے ان گناہوں کا کفارہ ہوجائے گا جو اس سے ماضی میں سرزد ہوئے۔)

"عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم لن یشبع المومن من خیر یسمعه حتی یکون منتھاہ الجنة".

(ترمذی: ۹۸/۲)

(حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کا پیٹ خیر کی بات سننے (یعنی علم دین حاصل کرنے) سے کبھی نہیں بھرتا، یہاں تک کہ جنت ہی اس کا منتہا ہوتی ہے۔)

"عن الحسن مرسلاً قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من جاءہ الموت وھو یطلب العلم لیحی بہ الاسلام فبینہ وبین النبیین درجۃ واحدۃ فی الجنۃ".(رواہ الدرامی: ۱/۱۰۰)

(حضرت حسن بصری سے بطریق ارسال مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کی موت ایسی حالت میں آئے کہ وہ (محض اس مقصد سے) علم حاصل کر رہا تھا کہ اس کے ذریعہ اسلام کو پھیلائے گا، تو جنت میں اس کے اور انبیاء کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق رہے گا۔)

ان سب فضیلتوں کے حصول کے لیے ایک مومن کو چاہئے کہ اپنی پوری زندگی کو طالب علمانہ بنالے، ہر وقت دین کی بات کا طالب رہے، اس بات سے بے پرواہ ہو کر کہ کیا حاصل ہوا اور کیا نہیں، اگر حاصل ہو گیا تو مقصد بر آری ہوئی اور اگر نہ حاصل ہوا تب بھی ثواب کہیں نہیں گیا۔

"عن واثلۃ بن الاسقع قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من طلب العلم فادرکہ کان لہ کفلان عن الاجر فان لم یدرکہ کان لہ کفل من الاجر".(رواہ الدارمی: ۱/۹۷)

(حضرت واثلہ بن اسقع بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص طلب علم میں لگا اور پھر علم حاصل کر لیا تو اس کو دوہرا اجر ملے گا اور اگر وہ نہ حاصل کر سکا تو ایک اجر ملے گا۔)

اس روایت میں کند اور ذہین دونوں قسم کے طلبہ کے لیے بشارت ہے کہ انہیں مایوس نہیں ہونا چاہئے، مقدور بھر کوشش اور طلب رہنی چاہئے اولاً کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملے گا اور اگر نہ ملا تو ثواب اور رضائے الٰہی جو مقصود و مطلوب مومن ہے اس سے دامن خالی نہیں رہے گا۔

یہی نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طالب علموں کی فضیلت اور اللہ ربّ العزت کے یہاں ان کے مقرب ہونے کو بیان فرمایا، بلکہ امت کو طالب علموں کے ساتھ خیر

خواہی ، ہمدردی اور غمگساری کا تاکیدی حکم بھی فرمایا ہے، اس لیے ہم لوگوں کو ان کے ساتھ عزت وبھلائی کا معاملہ رکھنا چاہئے ،ممکن ہو اور وہ ضرورت مند ہوں تو ان کی مدد کرنا چاہئے ۔ان کو حقارت کی نظر سے دیکھنے اور ستانے کی صورت میں ،قیامت کے دن آقا ئے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دیکھائیں گے:

”عن ابی سعید الخدری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان الناس لکم تبع وان رجالاً یاتونکم من اقطار الارض یتفقھون فی الدین واذااتوکم فاستوصوا بھم خیراً“. (ترمذی: ۹۳/۲)

(حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہم صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا: دیکھو! لوگ تمہارے تابع دار ہیں (یعنی میرے بعد میری امت والے تمہارے پیروری کریں گے،تمہارے طریق پر چلیں گے اور تمہیں میرے اصحاب اور میرا براہ راست فیض یافتہ سمجھ کر) اطراف عالم سے کتنے ہی لوگ دین کا علم وفہم حاصل کرنے کے لیے تمہارے پاس آئیں گے، پس جب وہ آئیں تو ان کے ساتھ خیر خواہی اور اچھا سلوک کرنے میں تم میری وصیت قبول کرو (یعنی میں ہدایت کرتا ہوں کہ ان لوگوں کے ساتھ اچھا معاملہ رکھنا، ان کو علم دین کی تعلیم دینا اور ان کو اچھی باتوں کی وصیت ونصیحت کرنا)۔“

اولاد کی نگرانی کیجیے

اس میں شبہ نہیں کہ اولاد اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت، ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا سرور، گھر کی رونق، چمن کی بہار، دمِ زندگی اور جانِ محفل ہے، اولاد کے بغیر انسان کی زندگی ایک اجڑا ہوا گلستاں ہے، جس میں نہ دل کشی ہے نہ خوبصورتی، نہ دل آویزی ہے نہ دل بستگی۔ اولاد نہ ہوتو زندگی بے کیف اور بے سود نظر آتی ہے، کمانا بے فائدہ دکھائی دیتا ہے، ہر انسان اپنی زندگی میں ادھوراپن اور کمی محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ والدین کو اولاد سے بے پناہ لگاؤ، محبت اور انس ہوتا ہے، ان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ دنیا کی تمام نعمتیں اولاد کے قدموں میں لاکر ڈال دیں، اپنی ذات سے کہیں بڑھ کر والدین کو اولاد کی راحت وسکون کی فکر رہتی ہے۔ جو ایک اچھی بات اور قابلِ تحسین عمل ہے۔

لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ اولاد کے تئیں والدین کی فکر اکثر دنیا کے تعلق سے رہتی ہے کہ وہ کیا کھائے گا؟ کیا پہنے گا؟ کہاں رہے گا؟ دولت اس کے پاس کس قدر ہے؟ اسے کوئی تکلیف اور پریشانی تو لاحق نہیں؟ جب کہ زندگی کے دو حصے ہیں، ایک دنیا کی زندگی ہے جو ایک مدت کے بعد ضرور بالضرور ختم ہوجائے گی، دوسری آخرت کی زندگی ہے جسے فنا نہیں ہے، ہمیشہ ہمیش اس جہاں میں رہنا ہے۔ دنیا کی زندگی عمل کی زندگی ہے، اور آخرت دنیا کی زندگی میں کیے گئے عمل کا بدلہ پانے کی زندگی۔ وہاں نہ دولت کام آئے گی نہ حسب ونسب، اگر اچھے اعمال ہوں گے اچھا بدلہ ملے گا، جنت جیسی عظیم نعمت رہنے کے لیے ملے گی، اور اگر دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی نافرمانی کی گئی ہوگی، اس کے رسول کے بتلائے ہوئے راستے سے ہٹ کر زندگی گزاری گئی ہوگی تو ایسے

نافرمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے، جو آگ کا عذاب ہوگا۔

اولاد کے ساتھ یہ کون سی سچی محبت ہے کہ اس کی وقتی اور عارضی زندگی کے سکون و راحت کا تو ہم انتظام کریں اس کے لیے رات و دن فکرمند رہیں، لیکن اس کی آخرت کی اس زندگی سے انتہائی بے فکر اور لاپرواہ رہیں، جہاں ہمیشہ ہمیش رہنا ہے، کیا ہم نے کبھی یہ فکر کی کہ ہمارے بچوں کی آخرت کی زندگی کیسی بن رہی ہے، کیا اس کے عقائد ایسے ہیں کہ وہ مستحق جنت ہو سکے گا؟ کیا اس کے اعمال ایسے ہیں کہ وہ اللہ کی پکڑ سے بچ جائے گا؟ حالاں کہ اصل فکر کرنے کی یہی چیزیں تھیں، دنیا تو جیسے تیسے یقینا ایک دن کٹ جائے گی، لیکن آخرت تو وہ جگہ ہے جہاں فنا نہیں ہے۔

اولاد سے سچی محبت یہی ہے کہ اس کے عقائد کو درست رکھا جائے، اس کے اعمال کی نگرانی کی جائے، اس کے دل میں اللہ و رسول سے محبت قائم کی جائے، قرآن و حدیث کی کم سے کم اتنی تعلیم تو ضرور دی جائے جس سے وہ دین کی جانب سے اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض و سنن سے واقف ہو سکے اور اپنے عقائد کو درست رکھ سکے۔ اللہ ربّ العزت خود اس جانب والدین کو متوجہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا. (التحریم:٦)

(اے ایمان والو! اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ)

والدین سے صرف ان کی ذات ہی کی بابت آخرت میں سوال نہیں ہوگا، بلکہ زیر تربیت اولاد اور دیگر افراد کی بابت بھی سوال ہوگا، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"عن عبداللہ بن عمر قال النبي صلی اللہ علیه وسلم: كلكم راع و كلكم مسئول عن رعيته، فالإمام راع و هو مسئول عن رعيته، والرجل راع على أهله و هو مسئول، والمرأة راعية على بيت زوجها و هي مسئولة والعبد راع على مال سيده و هو مسئول، ألا كلكم راع و كلكم مسئول. (ابن ماجة: ٢٦١)

(حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا

کہ تم میں سے ہر ایک نگراں ہے، اور ہر ایک سے اس کی زیر نگرانی افراد کے بارے میں سوال ہوگا، حاکم نگراں ہے اس سے اس کی زیر نگرانی افراد کے بارے میں سوال ہوگا، مرد اپنے گھر والوں پر نگراں ہے، اس سے ان کی بابت سوال ہوگا، عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے، اس سے اس کی بابت سوال ہوگا اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگراں ہے، اس سے اس کی بابت سوال ہوگا، سنو تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور ہر ایک سے اس کی زیر نگرانی افراد کے بارے میں سوال ہوگا (کہ ان کے بارے میں جو ذمہ داری اس پر عائد کی گئی تھی، اس کو پورا کیا یا نہیں)

ہمیں ضرور یہ دیکھنا چاہیے کہ اولاد کے تعلق سے شریعت کی جانب سے ہمارے اوپر جو ذمہ داری عائد کی گئی ہے ہم بحسن وخوبی اسے انجام دے رہے ہیں یا نہیں اور ہماری اولاد سیدھے راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔

اس حقیقت کا انکار ممکن نہیں کہ چوری، ڈکیتی قتل وغارت گری، زنا کاری وبدکاری، شراب نوشی وگالم گلوچ جیسے بُرے کام جنھوں نے معاشرے کو ہلاک کر کے رکھ دیا ہے زیادہ تر انہیں لوگوں کی اولادوں سے سرزد ہوتے ہیں جو اپنی اولاد سے لاپرواہ رہتے ہیں اور درست طریقے سے ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام نہیں کرتے۔

شریعت اور معاشرہ دونوں کی جانب سے ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم اس بات پر سخت نظر رکھیں کہ ہمارے بچے اور بچیاں گھر سے باہر کس وقت جاتے ہیں اور باہر رہ کر کیا کرتے ہیں، کن کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں، مدرسے اور اسکول میں ان کا میل جول کس قسم کے بچوں سے ہے، ان کا لباس کیسا رہتا ہے، خصوصاً بچیوں کے لباس کے تعلق سے والدین کو بہت زیادہ احساس رہنا چاہیے اور قطعاً ایسے لباس زیب تن نہ کرنے دینا چاہیے جو جذبات برانگیختہ کرنے والے ہوں، کیا کھاتے اور پیتے ہیں، اگر شراب کی لت پڑ رہی ہو یا سگریٹ، گٹکھا یا اس قسم کی کسی اور چیز کی تو فوراً اس پر کنٹرول کیجیے۔

موبائل اور انٹرنیٹ زہر قاتل ہیں، جسے آپ بچوں کے ہاتھوں میں پکڑا کر بے فکر

ہوجاتے ہیں، اگر ضرورتاً انہیں دیں تو سخت نگرانی رکھیں کہ وہ ان کے ذریعہ کن لوگوں سے رابطہ کرتے ہیں اور کس قسم کے پروگرام دیکھتے ہیں۔

اگر ہم اولاد کی تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی نظر رکھیں تو نہ کسی بچی کی عصمت لوٹی جائے اور نہ کوئی قتل ہو، یہ سب انجام ہے اس مغربی معاشرے کا جس میں لڑکے اور لڑکیوں کو آزادی کے نام پر بے لگام چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ جو چاہتے ہیں دن رات کرتے پھرتے رہتے ہیں۔

اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے اور ہماری اولاد کو صالح بنائے۔آمین

شب برأت کو خرافات سے بچیئے

ماہِ شعبان کی پندرہویں رات، جہنم سے آزادی حاصل کرنے کی رات ہے، گناہوں سے مغفرت طلب کرنے کی رات ہے، اللہ رب العزت کو راضی کرنے کی رات ہے، وہ لوگ کتنے مبارک ہیں، کتنے کامیاب وکامران ہیں، جو اس رات میں لہو ولعب سے بچ کر اپنے رب کو راضی کرنے کے لئے شب بیداری کرتے ہیں، قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اور رب غفور سے انتہائی تضرع والحاح کے ساتھ اپنے گناہوں کی معافی کے طلب گار ہوتے ہیں۔

اس رات کو لیلۃ البرأت، لیلۃ المبارکۃ، لیلۃ الرحمۃ اور لیلۃ الصک بھی کہا جاتا ہے۔ لیلۃ البرأت کا فارسی زبان میں ترجمہ ''شب برأت'' یعنی نجات کی رات ہے۔ لیلۃ المبارکۃ کے معنی ''برکت کی رات'' ہے۔ لیلۃ الرحمۃ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس رات اللہ جل شانہ کی رحمتوں کی بے حساب بارش ہوتی ہے۔ ''صک'' کے معنی عربی زبان میں ''چک'' کے ہیں یعنی کسی معاملہ کو پختہ اور مستند کرنے کے لئے تحریر لکھ دینا۔ پس لیلۃ الصک کہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس رات پورے سال کے واقعات جو ہونے والے ہوتے ہیں تحریر کر دیئے جاتے ہیں۔

احادیث میں اس رات کی بہت فضیلت آئی ہے، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ ایک رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدے کی حالت میں زار وقطار رو رہے تھے۔ اسی وقت وہاں حضرت عائشہ صدیقہ پہنچ گئیں، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بڑی رقت اور آنسوؤں کے ساتھ امت مسلمہ کے لئے بخشش کی دعا مانگتے ہوئے دیکھا۔ یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے ام المومنین فرماتی ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا سے فارغ ہوئے، تو فرمایا:

اے عائشہ! تم جانتی ہو کہ یہ کون سی رات ہے۔ ام المومنین نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کے سوا بھلا کس کو علم ہوسکتا ہے؟ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: آج شعبان کی پندرہویں شب ہے، اس رات جس نے اللہ کی عبادت کی، دربارِ الٰہی میں اس کی ہر دعا قبول ہوتی ہے، خواہ وہ اپنی بلندی اور وسعتوں کے اعتبار سے پہاڑ کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''اٹھو ماہِ شعبان کی پندرہویں شب کو، کیوں کہ یقینی طور پر یہ رات مبارک ہے۔ اس میں رحمتِ الٰہی صبح تک آسمان دنیا پر جلوہ گر ہو کر یہ صدا دیتی ہے کہ کوئی ہے اس جنس کا خریدار جو دامن پھیلائے اور مرادوں سے بھر کر لے جائے، جو ندامت کے آنسو بہائے اور صلہ میں گہر پائے رحمت حاصل کرے۔ جو بیماری سے نجات کا طلب گار ہو اور شفایاب ہو، جو آسودہ حالی کا متمنی ہو اور رزق میں کشادگی اور برکتوں سے بہرور ہو۔

ام المؤمنین حضر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات میری آنکھ کھلی تو میں نے حضور ﷺ کو بستر پر نہ پایا، میں آپ ﷺ کو تلاش کرنے باہر گئی تو آپ ﷺ بقیع کے قبرستان میں نظر آئے۔ بعد میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل امین آئے تھے، اور انہوں نے کہا ''آج نصف شعبان کی رات ہے، اس میں قبرستان میں جا کر مردوں کے لئے دعائے مغفرت کرو۔''

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ﷺ شعبان میں کثرت سے روزے کیوں رکھتے ہیں؟ ارشاد مبارک ہوا ''اُسامہ یہ بہت ہی مبارک مہینہ، رجب المرجب اور رمضان المبارک کے درمیان واقع ہوا ہے، جس سے لوگ غافل ہیں۔ اس ماہ میں انسانوں کے اعمال کو رب جلیل کے حضور پیش کیا جاتا ہے۔ لہٰذا میں اس ماہ کو بے حد محبوب رکھتا ہوں، تاکہ میرے اعمال میرے رب کے سامنے پیش ہوں تو اس وقت میں روزہ کی حالت رہوں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت کے مطابق شعبان المعظم کی پندرہویں شب کو مسلمانوں کی ارواح مقدسہ اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتی ہیں اور

اپنے وارثوں سے کہتی ہیں ہمارا کوئی ہے جو ہمیں یاد کرے، یا ہم پر رحم کھائے، ہم آج کس قدر بے بسی اور بے کسی کی حالت میں ہیں۔ اگر تم ہماری ناتوانی محسوس کرو تو دنیا کی تمام آسائش و آرام کو بھول جاؤ گے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات اپنی تمام مخلوق کی جانب توجہ فرماتے ہیں اور سب کو بخش دیتے ہیں، مگر شرک، جادوگر، کینہ پرور، شرابی، سودخور، بخیل، والدین کے نافرمان اور قطع رحمی کرنے والے محروم رہیں گے، جب تک سچی توبہ نہ کرلیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب شعبان کی رات آئے تو شب بیداری کرو، نماز پڑھو، اور دن کو روزہ رکھو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اس رات غروب آفتاب کے بعد آسمان دنیا پر تجلی فرماتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے، ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ ہم اس کی توبہ قبول کریں، ہے کوئی رزق کا طالب کہ ہم اس کو رزق عطا کریں، ہے کوئی گرفتار بلا کہ ہم اس کو مصیبت سے نجات دیں۔ یہ صدائے عام اسی طرح برابر جاری رہتی ہے، یہاں تک کہ صبح صادق ہو جائے۔

خلاصہ یہ کہ یہ انتہائی مبارک رات ہے، جس میں اللہ رب العزت بندوں پر خصوصی رحمتوں کا نزول فرماتے ہیں، اور ہر اس شخص کے لیے مغفرت کے دروازے کھول دیتے ہیں، جو گناہوں سے توبہ واستغفار کر کے رب ذوالجلال والاکرام کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔

لیکن افسوس اس انتہائی بابرکت رات کو بھی آج ہم نے لہو ولعب کی رات بنا دیا ہے، حلوے مانڈے بنا لیتے ہیں، آتش بازی کرتے ہیں، محلے اور سڑکوں پر ہمارے لڑکے ہلڑ بازی کرتے پھرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس شب کا حق ادا کر دیا، حالانکہ اپنی ان غلط حرکتوں کی وجہ سے ہم مزید اللہ رب العزت کے غضب کا سبب بنتے ہیں۔

یاد رہے کہ جن اوقات اور مقامات میں عبادت کا ثواب زیادہ ہوتا ہے، ان اوقات اور مقامات میں معصیت کا کام کرنے کا گناہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے چاہئے تو یہ کہ

اس مبارک شب میں نماز، تلاوت قرآن اور ذکر اللہ میں مشغول رہا جائے۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو باجماعت عشاء کی نماز پڑھ کر کچھ نوافل، وغیرہ پڑھ لے، تھوڑی دیر اللہ رب العزت سے دعائیں مانگ لے، قبرستان میں جا کر اپنے مرحومین کے لیے دعا مانگے، اس کے بعد سو جائے۔ پھر تہجد کے وقت اٹھ کر تھوڑی دیر عبادت کر لے، ورنہ فجر کی نماز باجماعت ادا کر لے۔ اور پھر دن میں روزہ رکھے۔

لیکن ہرگز ہرگز معصیت کا کوئی کام نہ کرے۔ آتش بازی سے بچے، ٹی وی و فلم بینی وغیرہ سے بچے، لہو ولعب سے اپنے بچوں کو بچائے، سڑکوں پر موٹر سائیکلوں کی ریس نہ کرنے دے، ہوٹلوں اور چوراہوں پر ہلڑ بازی نہ کرنے دے، بلکہ اپنے ساتھ انہیں بھی عبادت میں لگائے، دعا مانگنے کا طریقہ سکھلائے، دعا کے فوائد بیان کر کے اللہ تعالیٰ سے خوب الحاح وزاری کے ساتھ دعا مانگنے کی تاکید کرے، زیادہ سے زیادہ قرآن کریم پڑھنے کی جانب متوجہ کرے۔ اپنے ساتھ انہیں بھی قبرستان لے جائے اور مرحومین کے لئے دعا کرنے کا حکم کرے۔ وماتوفیقی الا باللہ.

اللہ رب العزت ہم سب کو سنت کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ (آمین)

شبِ قدر کی قدر کیجئے

یوں تو پورا ماہ رمضان ہی اپنی بے شمار رحمتوں اور برکتوں کے ساتھ سایہ فگن رہتا ہے۔لیکن اس کی ایک شب ایسی فضیلت و برکت کی حامل ہے کہ وہ ہزار مہینوں سے افضل ہے یہ شب، شب قدر کہلاتی ہے۔اس کی عظمت و برتری کے لیے یہی کافی ہے کہ اللہ رب العزت نے مستقل ایک سورت ہی اس کی فضیلت وعظمت کے بیان میں نازل فرمائی ہے چنانچہ اس کا ارشاد ہے:

''اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۞ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۞ لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۞ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ الرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۞ سَلٰمٌ هِیَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۞''

(بے شک ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا اور آپ کو معلوم ہے کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔اس میں فرشتے اور روح القدس اپنے رب کے حکم سے ہر امر کو لے کر اترتے ہیں۔ وہ سراپا سلامتی ہے وہ فجر کے طلوع ہونے تک رہتی ہے۔)

ہزار مہینے کے ۸۳ ر سال ۴ ر ماہ ہوتے ہیں۔ پھر شب قدر کو اس سورۂ مبارکہ میں ہزار مہینے کے برابر نہیں بتلایا گیا ہے، بلکہ ہزار مہینے سے بہتر بتایا گیا ہے۔کس قدر بہتر ہے اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ نیز آیت کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ برکت رات کے کسی خاص حصے ہی میں نہیں رہتی بلکہ پوری رات شروع حصے سے لے کر صبح صادق ہونے تک برابر شب قدر اپنی خیرات و برکات کے ساتھ باقی رہتی ہے۔

الحاصل شب قدر بہت ہی خیر و برکت کی رات ہے۔صرف ایک رات جاگ کر

عبادت کر لینے سے ہزار مہینوں سے زیادہ کا ثواب مل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ان هذا الشهر قد حضر وفيه ليلة خير من الف شهر من حرمها فقد حرم الخير كله ولا يحرم خيرها الا كل محروم" (مشکوٰۃ: ۱۷۳)

(بے شک ماہ رمضان سایہ فگن ہوگیا ہے۔ اس میں ایک ایسی شب ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جو شب قدر سے محروم ہوگا گویا وہ پوری بھلائی سے محروم ہوگا اور شب قدر کی خیر سے وہی محروم ہوتا ہے، جو کامل محروم ہو۔)

مطلب یہ ہے کہ چند گھنٹے کی رات ہوتی ہے اور اس میں عبادت کر لینے سے ہزار مہینے سے زیادہ عبادت کرنے کا ثواب ملتا ہے۔ چند گھنٹے بیدار رہ کر نفس کو سمجھا بجھا کر عبادت کر لینا کوئی ایسی قابل ذکر تکلیف نہیں جو برداشت سے باہر ہو، تکلیف ذرا سی اور ثواب بہت بڑا، اگر کوئی شخص ایک پیسہ تجارت میں لگاوے اور کروڑوں کا نفع پائے، اس کو کتنی خوشی ہوگی اور جس شخص کو اتنے بڑے نفع کا موقع ملا، پھر اس نے توجہ نہ کی اس کے بارے میں یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ وہ پورا اور پکا محروم ہے۔

یہ شب کب آتی ہے۔ اس کی تعیین نہیں کی گئی ہے۔ لیکن اتنی بات متحقق ہے کہ ماہِ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں آتی ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"تحروا ليلة القدر في الوتر من العشر الاواخر من رمضان"

(مشکوٰۃ: ۱۸۱)

(شب قدر کو تلاش کرو ماہِ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں)

اس رات کو پانے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ آخری عشرے کا اعتکاف کرے اور کام کاج سے یکسو ہو کر مسجد میں جا کر فروکش ہو جائے۔ راتوں کو عبادت کرے، دن میں تھوڑا بہت آرام کرے۔ لیکن اگر یہ دشوار ہو تو ۲۱/ ۲۳/ ۲۵/ ۲۷/ ۲۹/ کی راتوں میں زیادہ سے زیادہ عبادت کرنے، اللہ رب العزت سے اپنے گناہوں کی معافی طلب

کرنے، اور اپنے لیے رحمت و بخشش طلب کرنے کی کوشش کرے۔ عام معمول سے کچھ زیادہ وقت عبادت میں مصروف رہے۔ نماز بھی زیادہ سے زیادہ پڑھے، قرآن کریم کی تلاوت کرے، تسبیح وتحمید میں مشغول رہے۔ درود وسلام پڑھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ کون سی رات شب قدر ہے تو میں اس میں کون سی دعا مانگوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ". (مشکوٰۃ: ۱۸۲)

(اے اللہ بے شک آپ معاف کرنے والے ہیں، معاف کرنے کو پسند کرتے ہیں، لہٰذا مجھے معاف فرما دیجئے)

اس دعا میں ہمیں یہ تعلیم دی گئی کہ اصل کامیابی وکامرانی آخرت کی ہے۔ اگر انسان آخرت میں کامیاب ہوگیا اور جہنم سے نجات مل گئی تو کوئی پرواہ نہیں کہ دنیا کیسے کٹی۔ لیکن اگر آخرت میں پکڑ ہوگئی اور اللہ رب العزت کے غضب کا سامنا ہوا تو اس سے بڑی کوئی ناکامی نہیں ہے۔ اس لیے ہر مومن کو ہمیشہ اپنی آخرت یاد رکھنی چاہئے، گناہوں سے باز رہ کر، ماضی میں جو گناہ ہو چکے ہیں ان سے معافی طلب کرتے رہنا چاہئے اور کسی ایسے موقعہ کو نہیں گنوانا چاہئے جس میں توبہ کے مقبول ہونے کا امکان ہو۔

توبہ کے لئے شب قدر سے بہتر کون سا وقت ہوسکتا ہے، اس لیے اس شب میں خوب گڑگڑا کر، رو کر، ندامت کے ساتھ اپنے گناہوں سے توبہ کرنا چاہئے، معافی طلب کرنا چاہئے اور آئندہ کسی بھی قسم کی نافرمانی نہ کرنے کا عہد کرنا چاہئے، ساتھ ہی اپنی دنیاوی ضروریات حلال روزی، روزی میں وسعت، نیک صالح اولاد، اور ملک میں امن وامان وغیرہ کی بابت بھی دعائیں کرنا چاہیے۔ اپنے مرحومین کے لئے مغفرت طلب کرنا چاہئے، انہیں ایصالِ ثواب کرنا چاہئے۔

ویسے تو کبھی بھی کسی بھی جگہ اپنے رب ذوالجلال کی نافرمانی وگناہ سے بچنا ضروری ہے۔ لیکن خصوصی طور پر اس رات میں اگر عبادت کر سکے تو کرے ورنہ سو جائے۔ قطعاً

کسی قسم کا کوئی گناہ نہ خود کرے نہ اپنے بچوں اور اہل خانہ کو کرنے دے، ٹی وی بند رکھے، بچوں کو سڑکوں پر ہلڑ بازی سے باز رکھے، پٹاخہ وآتش بازی سے انہیں دور رکھے۔ اس لیے کہ جس جگہ یا جس وقت طاعت کا ثواب زیادہ ہوتا ہے، اس وقت نافرمانی کا گناہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے ایک حسین موقعہ عنایت فرمایا کہ شب قدر مل گئی ہے۔ گوھر مراد سے جھولی بھر لیجئے۔ خدا کی رحمتیں سمیٹ لیجئے۔ دامن عصیان کو دھل لیجئے۔ نہ جانے آئندہ یہ موقعہ ملے یا نہ ملے۔

۱۲؍ربیع الاوّل کو خلاف سنت کام نہ کیجئے

زید کا لڑکا خالد اپنے والد سے بے پناہ محبت کا دعویٰ کرتا، موقع بے موقع مبالغہ کی حد تک باپ کی تعریف کرتا، اوراس کے نام کا استعمال کر کے اس کے دوستوں اور متعلقین سے فوائد حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اگر کسی موقع سے زید اس سے کہتا کہ میرے پیارے بیٹے مجھے ایک گلاس پانی پلا دو، تو کہتا کہ ابا آپ سے محبت تو مجھے سب سے زیادہ ہے، لیکن پانی نہیں پلا سکتا، آپ کسی اور سے مانگ لیں۔ باپ کبھی کہتا کہ فلاں کام کر دو، کہتا ہے کہ محبت تو مجھے سب سے زیادہ ہے لیکن کام کسی اور سے کروا لیجیے۔ اس کے بالمقابل زید کا دوسرا لڑکا راشد باپ کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے محبت کے زبانی دعوے تو بہت زیادہ نہیں کرتا، لیکن اس کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیے رہتا ہے، اس کے ابرو اشارے پر جان دینے کے لیے تیار رہتا ہے اور ہر طرح کی اس کی خدمت کرنے کو سعادت تصور کرتا ہے۔

فیصلہ آپ فرمائیں کہ باپ سے محبت کے دعویٰ میں کون سچا ہے؟ خالد جو کہ زبانی طور پر محبت کے دعوے تو بہت کرتا ہے، لیکن اس کے احکامات کی پروا نہیں کرتا، جب کہ راشد بے موقع دعوائے محبت تو نہیں کرتا لیکن کسی حکم سے روگردانی نہیں کرتا۔ بلا شبہ ہر عقل سلیم یہی فیصلہ کرے گی کہ جو بیٹا باپ کے احکامات کی اطاعت کرتا ہے وہی حقیقتاً محبت کرنے والا ہے، زبانی طور پر محبت کا دعویٰ کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، برخلاف اس لڑکے کے جو زبانی تو دعویٰ کرتا ہے لیکن باپ کے کسی حکم کو بجالانے کے لیے تیار نہیں۔

یہ مثال فِٹ آتی ہے ہمارے زمانے کے جشن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم منانے والوں پر۔ کہ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں اور تعلیمات واحکامات کو پس پشت ڈال کر

جشن منایا جاتا ہے، پٹاخے داغے جاتے ہیں، جلوس نکالا جاتا ہے، مردوں اور عورتوں کا مخلوط اجتماع ہوتا ہے، قوالیاں ہوتی ہیں، اور نہ جانے کیا کیا خرافات و بدعات کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔

افسوس کہ یہ سب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کے اظہار میں کیا جاتا ہے، اور یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ہم ہی لوگ اصلاً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرنے والے ہیں، اس کے برخلاف جو لوگ تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس طرح کے اجتماعات کو بدعت قرار دیتے ہیں اور اس میں ادا کی جانے والی رسموں کو خرافات وفسق و فجور کہتے ہیں، انھیں بددین و گمراہ کہا جاتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت نہ کرنے والا کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ اصلاً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرنے والے وہی حضرات ہیں جو آپ کی سنتوں اور تعلیمات پر عامل ہیں، اس کے فروغ کی کوشش کرتے ہیں اور ہر ایسے عمل کو بدعت و گمراہی قرار دیتے ہیں جو آپ کی تعلیمات کے خلاف ہو۔ کیوں کہ محبت کا اصل معیار اطاعت ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

"قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ"۔

(آپ لوگوں سے فرما دیجیے کہ اگر تم بزعم خود اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو، تو تم لوگ میرا اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے)

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اطاعت ہی کو اصل قرار دیا ہے، اور انھیں لوگوں کو مستحق جنت قرار دیا ہے، جو آپ کے احکامات وتعلیمات پر عامل ہوں گے، چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"کل امتي یدخلون الجنة إلا من ابی، قیل و من ابی؟ قال من اطاعني دخل الجنة و من عصاني فقد أبی" (بخاری)

(میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی، سوائے اس شخص کے جس نے انکار کر دیا، پوچھا گیا کس نے انکار کر دیا؟ فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا،

اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کردیا۔) معلوم ہوا کہ بلا اطاعت دعوائے محبت، دعویٰ بلا دلیل بلکہ جھوٹا دعویٰ ہے، اور اس دعوے سے نہ تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے اور نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت۔

۱۲/ ربیع الاوّل کو تاریخ ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مناسبت سے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منانا، یا دوسری زبان میں آپ کی سالگرہ منانا نہ آپ کی تعلیمات سے ثابت ہے اور نہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو آپ کی ایک ایک سنت پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے تھے، سے لے کر سلف صالحین کے دور تک امت نے ایسا کوئی جشن منایا۔ غیروں کی دیکھا دیکھی ہم نے بھی اسلام میں ایک ایسی نئی چیز داخل کردی جو آپ کی تعلیمات کے خلاف ہے اور پھر یہی نہیں کہ اس موقع پر اگر صرف آپ کا ذکر کیا جاتا، آپ کے طریقے و تعلیمات کے مطابق زندگی گذارنے کا عہد کیا جاتا تو بات غنیمت ہوتی، ایسی ایسی خرافات کی جاتی ہیں، رسمیں ادا کی جاتی ہیں، سڑکوں پر ہلڑ بازی کی جاتی ہے، عیاشی کے طریقے ڈھونڈھے جاتے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ افسوس مسلمانوں کو کیا ہوگیا، اپنے نبی کی تعلیمات سے ہٹ کر غیروں کے طریقوں کو اپنا رہا ہے اور اسے دین کا نام بھی دے رہا ہے۔

اے مسلمانو! اگر دنیا و آخرت کی کامیابی چاہتے ہو، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اللہ ربّ العزت سے واقعتاً محبت ہے تو قرآن و سنت کو مضبوطی سے تھام لو اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال لو، یہی ذریعہ نجات ہے اور یہی کامیابی کی کنجی ہے۔ نبی اکرم کی تعلیمات اور آپ کی سنت کو پس پشت ڈال کر عشق رسول کا دعویٰ، جھوٹا اور فریب ہے۔ عاشق رسول اصلاً وہی ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کریں۔

محبت الٰہی سے دل کی دنیا آباد کیجئے

جس طرح ذات باری ہی کی عبادت ہم پر لازم ہے، اس کے علاوہ کسی کی عبادت جائز نہیں ہے، اسی طرح حقیقی محبت بھی صرف اسی کے ساتھ رکھنا ضروری ہے، کیوں کہ محبوب حقیقی وہی ہے، اس کے علاوہ کسی سے حقیقی محبت روا نہیں ہے۔

اللہ کی محبت کے وجوب پر اس کی تمام نازل فرمودہ کتابیں، تمام رسولوں کی دعوت، خود انسانی فطرت جس پر اللہ نے اسے پیدا فرمایا ہے، وہ عقول جو اپنے بندوں کو ودیعت فرمائی ہے اور وہ سب نعمتیں جو ان پر عام فرمائی ہیں وہ سب دلالت کرتی ہیں، کیوں کہ قلوب ہر اس شخص کے ساتھ طبعی طور پر محبت کرتے ہیں جو ان سے حسن سلوک اور نوازش وانعام کا معاملہ کرتا ہے، تو پھر کیوں کر اس ذات سے محبت نہ کریں، کہ تمام احسان واکرام کا معاملہ جس کی طرف سے ہے اور ساری مخلوق پر جو بھی نیکی وبھلائی پہنچتی ہے اسی ذات وحدہٗ لاشریک کے فضل وکرم ہی سے ہوتی ہے۔

اللہ کی طرف سے جو کچھ بھی بندے کو پہنچتا ہے ان میں اس کے لئے اللہ سے محبت کا پیام مضمر ہوتا ہے، چاہے بندہ انہیں پسند کرتا ہو یا ناگوار، اس کی عطا وبخشش اور اس سے رک جانے، اس کے درگذر کرنے اور اس کی آزمائش، اس کے روزی کے تنگ کرنے اور اسے وسیع کرنے، اس کے عدل وفضل اور اس کے مارنے جلانے، اس کی بھلائی، اس کی رحمت، اس کے احسان، اس کی ستاری، اس کے عفو وحلم، اس کے اپنے بندوں پر صبر کرنے اور اس کی دعا کے قبول کرنے، اس کی مصیبت کو دور کرنے، اس کی فریاد کو سننے اور اس کی تکالیف کو زائل کرنے میں قلوب کے لئے اللہ کی بندگی اور اس کی محبت کی دعوت کا سامان موجود ہے۔ اگر ایک شخص کسی کے ساتھ ادنیٰ درجہ کی کوئی نیکی وبھلائی کر دیتا ہے

تو اس کا دل اس کی محبت کے لئے بے اختیار ہوجاتا ہے، پھر بندہ اپنے دل اور اعضاء سے اس ذات وحدہٗ سے محبت کیوں کر نہ کرے، جس کی بے پناہ بھلائی اور احسان کو اپنے گناہوں کے باوجود ہر وقت جلوہ ریز پاتا ہے۔

پس اللہ کی طرف سے خیر بندہ کی طرف آتی ہے اور بندہ کا شر اللہ کی طرف پہنچتا ہے، اللہ تعالی اپنی نعمتوں سے مخلوق کے نزدیک محبوب بن جاتا ہے، حالانکہ وہ مخلوق سے بے نیاز ہے اور بندہ اپنے معاصی سے اللہ رب العزت کے نزدیک مبغوض ہوجاتا ہے، حالانکہ بندہ اس کا ضرورت مند ہے، نہ تو اس کا احسان، اس کی نیکی اور اس پر اس کا انعام، اسے اس کے گناہ سے روکتا ہے اور نہ بندے کی معصیت اور کمینگی سے اس کے پروردگار کا فضل واحسان منقطع اور ختم ہوتا ہے۔

مخلوق میں سے جس سے بھی انسان محبت کرتا ہے اور دوسرا اس سے محبت کرتا ہے، تو اس سے اس کا ارادہ اپنی ذات کے لئے ہوتا ہے اور دوسرے کی کوئی غرض اس سے وابستہ ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالی کی محبت جو ہوتی ہے وہ صرف اپنے لئے ہوتی ہے۔

مخلوق میں سے جس کے ساتھ بھی آپ معاملہ کرتے ہیں، اگر اس معاملہ میں اس کے لئے کوئی فائدہ نظر نہ آئے تو وہ آپ کے ساتھ معاملہ نہیں رکھے گا، اس لئے یہ بات ضروری ہے کہ اس کے لئے کسی طرح کا بھی فائدہ ضرور ملے، لیکن اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ اس لئے معاملہ کرتا ہے کہ تم کو بڑے سے بڑا فائدہ حاصل ہو، اس لئے کہ وہ ایک درہم کے ثواب کو دس گنا سے سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ کر دیتا ہے، لیکن ایک برائی کا بدلہ ایک ہی سے دیتا ہے اور برائی بہت جلد مٹ بھی جانے والی ہوتی ہے۔

نیز اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے آپ کو اپنے لئے پیدا فرمایا اور دنیا اور آخرت کی تمام چیزیں آپ کے لیے پیدا فرمائیں، لہٰذا اس کی محبت کے سلسلہ میں جدوجہد صرف کرنے اور اس کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس سے زیادہ کون مستحق ہوسکتا ہے؟ پس اسی کا سب سے بڑا حق ہے کہ اسے یاد کیا جائے، اس کا شکر ادا کیا جائے، اس کی عبادت

کی جائے ،اس کی حمد وتعریف کی جائے۔اگر اس سے مدد طلب کی جائے تو سب سے زیادہ وہی مدد کرنے والا اور سب سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔اگر اس سے سوال کیا جائے تو سب سے بڑا افیاض اور سخی، فضل اور بخشش فرمانے والا ہے۔اگر اس سے رحم چاہا جائے تو بہت بڑا مہربان وشفیق۔اگر اس کا قصد کیا جائے ،تو غایت درجہ شریف اور بزرگ ہے۔اگر اس کی طرف پناہ لی جائے تو انتہائی قوی اور زبردست ہے۔اگر اس پر توکل واعتماد کیا جائے تو سب سے زیادہ کفالت کرنے والا ہے اپنے بندے پر اس ماں سے زیادہ رحم وشفقت کرنے والا ہے جو اپنے لڑکے پر کرتی ہے۔

جب کسی بندے کے دل میں محبوب حقیقی، خالق انس وجن، رب دوجہاں کی محبت موجزن ہوجاتی ہے ،تو یہی نہیں کہ یہ محبت اسے اس کے خالق سے ملادیتی ہے، بلکہ کائنات کے ذرہ ذرہ، ہرفرد بشر اور ہرمخلوق کی محبت اس کے دل میں پیدا کردیتی ہے، کیوں کہ وہ گردو پیش کی تمام چیزوں کے اندر اپنے محبوب حقیقی کا جلوہ دیکھتا ہے،جس کا روحانی شوق اور قلبی اشتیاق اپنی جانب کھینچ رہا ہوتا ہے،اب وہ ہر انسان کو اپنا بھائی اور ہرمخلوق کو اپنے محبوب کی مخلوق سمجھنے لگتا ہے۔اس خیال سے کہ ایک دن مرنے کے بعد محبوب باری کے سامنے کھڑا ہونا ہے، کیئے کرائے کا حساب دینا ہے، نہ تو کسی کو ستاتا ہے، نہ کسی کا حق ہڑپتا ہے،اور نہ کسی پر ظلم وزیادتی کرتا ہے۔

الحاصل یہ ایک ایسی پاکیزہ، بلندترین اور روحانی محبت ہے جو انسان کو اپنے اخلاق وکردار پر ناقدانہ نظر ڈالنے پر مجبور کرتی ہے، اخلاق حسنہ کے حصول پر آمادہ کرتی ہے اور اخلاق رذیلہ سے پاک ہونے پر ابھارتی ہے۔

اللہ کے لیے محبت کا مقام مقامات سلوک میں سے سب سے اعلیٰ ہے اور درجات عالیہ میں اس کا درجہ بہت اونچا ہے۔ سب سے انفع واحب اور اعلیٰ محبت وہی ہے کہ قلب اللہ کی محبت پر مجبور ہوجائے یعنی اس کی جبلت اور فطرت میں داخل ہوجائے اور انسانی فطرت اس کی معبودیت کے اقرار واعتراف پر مجبور ہوجائے۔اس کے اجلال،

اس کی عظمت، اس کے لیے خشوع وخضوع اور اس کی عبادت و بندگی کا اعتراف کرنے لگے اور عبادت صرف اللہ وحدہ کی ذات مبارک کے لیے خاص ہو جائے۔ عبادت در اصل کمال محبت ہی کا نام ہے جو کامل خضوع وذلت کے ساتھ ہو۔ اللہ تعالیٰ سے محبت لذاتہ ہر جہت سے مستقلاً اسی کے لیے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ سے محبت لذاتہ نہیں بلکہ اللہ کی محبت کی تبعیت میں ہوتی ہے۔

اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ. (الحجرات)

(مسلمان تو سب (دینی) بھائی ہیں، اس لیے اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کر دیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو، تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔)

تمام مسلمان دینی اور مذہبی رشتے سے آپس میں بھائی ہیں، خود غرضی، مفاپرستی، حسد اور بغض سے دور رہ کر ہر مسلمان پر ایک دوسرے کی خبر گیری، مزاج پرسی اور تعاون باہمی لازم ہے۔ جب تک ایک دوسرے کے لیے ہم دردی، ایثار وقربانی، غم گساری اور ناپسندیدہ امور پر صبر وتحمل کا جذبہ دل میں پیدا نہیں ہوگا، دل کو سکون میسر نہیں ہوسکتا اور مسلم معاشرہ ترقی نہیں کرسکتا۔ آج مسلمان انتشار واختلاف کا شکار ہے، اخلاق وکردار سے عاری ہو کر نفرت وعداوت میں مبتلا ہے، ایثار وہم دردی کا جذبہ مفقود ہے، حسد، کینہ، بغض اور کبر ونخوت جیسی صفاتِ رذیلہ نے مثبت فکر اور تعمیری عمل سے غافل کر رکھا ہے، اتحاد و اتفاق نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے، ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے، ایک دوسرے کی زمین ہڑپنے اور مال ہتھیانے کے درپے ہے۔ کیا کوئی قوم ایسے حالات میں ترقی کرسکتی ہے، اور معاشرے میں وقار وعظمت حاصل کرسکتی ہے، سچ کہا ہے کہ کسی نے

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

مسلمان پریشان ہے، غیر اس پر حملہ آور ہیں، اس کی جان اور مذہب کے دشمن اس کی تاک میں ہیں، ہر جگہ اور ہر طرح سے مار کھا رہا ہے، سیاسی طور پر بھی مفلوج ہوگیا ہے، اور سماجی طور پر، ملک کی سب سے بڑی اقلیت اور کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے

باوجود انتہائی کسمپرسی کی حالت سے دوچار ہے، نہ کوئی وقعت ہے نہ کوئی پرسانِ حال، خس وخاشاک کی طرح سیلاب جدھر چاہتا ہے بہا لے جاتا ہے۔

افسوس تو یہ ہے کہ خوابِ خرگوش میں مست یہ امت نہ اپنی حالت زار پر ماتم کناں ہے اور نہ ہی مستقبل کے لیے اس کے پاس کوئی لائحۂ عمل ہے، کدھر جانا ہے، کیا کرنا ہے، کیسے رہنا ہے، سب سے بے خبر۔ نہ قرآن سے کوئی تعلق نہ اس کی تعلیمات سے، نہ اپنی تاریخ سے واقف نہ مستقبل روشن کرنے کی فکر، معمولی معمولی باتوں پر جنگ وجدال کے لیے تیار، ''تو بڑی کہ میں بڑی'' میں گرفتار۔

کاش غافل سوچے سمجھے، اخلاقِ حمیدہ سے اپنے دلِ مردہ کو مزکی ومجلّٰی کرے، عدل و انصاف کو اختیار کرے، ایثار وقربانی کا جذبہ بیدار کرے، ملت کی زبوں حالی اور اس کی بے بسی کا درد محسوس کرے، آپسی اختلافات کو عدالتوں اور پولیس اسٹیشنوں میں لے جانے کی بجائے مل بیٹھ کر حل کرے، صلح صفائی کو شیوہ بنائے، ہر مسلمان کو اپنا بھائی سمجھتے ہوئے اخوت و بھائی چارگی کی فضا قائم کرے، قرآنی تعلیمات سے آگاہی حاصل کرے، اخلاقِ نبوی کو اسوہ بنائے، اپنی تاریخ کا مطالعہ کرے اور اپنوں وغیروں کو پہچان کر مستقبل کے لیے لائحۂ عمل تیار کرے۔ ورنہ کوئی طاقت اسے نجات نہیں دلا سکتی۔

خوش حال زندگی گذاریئے

آمدنی کی کمی خرچ کی زیادتی اور مزید دولت کی خواہش وحرص نے انسانی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے، ہر ایک چاہے ہزاروں میں کمانے والا ہو یا لاکھوں میں پریشان نظر آتا ہے، جس کی جو آمدنی ہے اس کا خرچ اس سے زیادہ ہے، پھر زمانے کا رونا روتا ہے کہ مہنگائی نے تباہ کر دیا، فلاں چیز نے مصیبت میں مبتلا کر دیا، سکون نصیب نہیں ہے، پریشانیاں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

کیا کبھی کوئی یہ بھی سوچتا ہے کہ اس کے اخراجات اتنے زیادہ کیوں ہیں، وہ کون سے اہم کام ہیں جن میں اس کو خون پسینے کی کمائی پانی کی طرح برباد ہو رہی ہے، کھانے پینے، رہن سہن اور دوا علاج میں کتنی رقم جارہی ہے اور بیوی بچوں کے فیشن، ناجائز مطالبات، ماڈرن بننے کے شوق، لوگوں کے دکھانے کی خواہش اور دولت کے اظہار میں، کس قدر رقم خرچ ہورہی ہے۔ انسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی کم ہے، اور زندگی گزارنے کے لیے محض دو روٹی، ایک کپڑا اور ایک سائبان بھی کافی ہے۔

ضرورت اعتدال کی ہے، اہم غیر اہم کی ہے، آپ پُرسکون زندگی اسی وقت گذار سکتے ہیں جب آپ اخراجات میں میانہ روی اختیار کریں گے اور ضروری وغیر ضروری میں فرق رکھیں گے، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آپ کو عطا کر رکھا ہے وہی آپ کی مقدر روزی ہے، چاہے آپ اسے ایک دن میں لٹا دیں اور چاہے احتیاط سے پیش آنے والی ضرورتوں میں استعمال کریں۔ شکوہ شکایت سے، کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔

ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو اسی کی تعلیم دی ہے، چناں چہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشة والتوادد الی الناس نصف العقل وحسن السوال نصف العلم۔“

(رواہ البیھقی فی شعب الإیمان، کذافی مشکوٰۃ: ۴۳۰)

(اخراجات میں میانہ روی اختیار کرنا نصف معیشت ہے، لوگوں سے انس ومحبت رکھنا نصف عقل ہے اور فہم وسلیقہ سے سوال کرنا نصف علم ہے۔)

اس حدیث شریف میں مذکور جن تین باتوں کی تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو دی ہے ان میں سے پہلی بات خرچ میں میانہ روی اختیار کرنے کی ہے، جسے آپ نے نصف معیشت قرار دیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اور اپنے متعلقین کی ضروریات زندگی میں خرچ کرنے میں نہ تو اسراف کرنا چاہیے اور نہ تنگی وسختی کرنا چاہیے، بلکہ اعتدال ومیانہ روی اختیار کرنا چاہیے، یہی زندگی کا آدھا سرمایہ ہے۔ بایں طور کہ انسان کی معاشی زندگی کا دارومدار دو چیزوں پر ہے، ایک آمدنی دوسرے خرچ، اور ان دونوں کے درمیان توازن ہی خوشحالی کی علامت ہے، اور معیشت کے مستحکم ہونے کا ذریعہ بھی، لہٰذا جس طرح آمدنی کے توازن کا بگڑنا، خوش حالی کے منافی اور معیشت کے عدمِ استحکام کا سبب ہے۔ اسی طرح اگر اخراجات کا توازن بگڑ جائے تو نہ صرف خوش حالی مفقود ہوگی بلکہ معیشت کا سارا ڈھانچہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ لہٰذا مصارف میں اعتدال اور خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنا معیشت کا نصف حصہ ہوا۔

حدیث شریف کے دوسرے جز کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ محبت ظاہر کرنا، اخلاق سے پیش آنا، اور ان کی محبت کو اپنے معاملات واحوال میں خیر وبرکت کا سرچشمہ جاننا اس عقل کا نصف حصہ ہے، جو حسن معاشرے کی ضامن ہے، گویا پوری عقل مندی یہ ہے کہ انسان کوئی کسب وپیشہ اور سعی ومحنت کرکے جائز روزی حاصل کرے اور اس کے ساتھ آپس میں محبت ومروّت کے جذبات بھی کارفرما رکھے۔ لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق کا برتاؤ کرنے والا، میل جول سے رہنے والا اور ایک دوسرے کے کام آنے والا ہی اصل سکون وراحت حاصل کرسکتا ہے، اس لیے کہ جب یہ لوگوں سے محبت وتعلق رکھے

گا تو دوسرے افراد بھی اس سے محبت رکھیں گے، ضرورت پر اس کے کام آئیں گے، اور اس کی زندگی کو پُرسکون بنانے میں معاون ہوں گے، اس کے برخلاف لوگوں سے بغض و حسد رکھنے والا اپنے آس پاس حاسدین ہی کو جمع کرے گا اور دشمنی کو بڑھائے گا، نتیجتاً کچھ لوگ اس کے سکون کو غارت کرنے کے درپے رہیں گے اور یہ ان سے الجھ کر اپنی پُرسکون زندگی کو برپا کردے گا۔

تیسری بات اس موقع پر جس کی تعلیم آپ ﷺ نے دی ہے وہ یہ ہے کہ جب کسی سے کوئی علمی سوال کرے تو خوب سوچ سمجھ کر اور اچھے ڈھنگ سے سوال کرے، اس کو مختصراً یوں سمجھیے کہ جب انسان سلیقہ مندی سے سوال کرے گا تو یہ علامت ہوگی کہ اس مسئلے سے متعلق اسے اجمالی علم ہے، پھر جب اسے درست اور صحیح جواب مل جائے گا تو اس مسئلے سے متعلق اس کا علم کامل اور مکمل ہو جائے گا۔ اس طرح سوال کرنے سے جواب دینے والا بھی نشاط اور تفصیل سے جواب دے گا، اس کے برخلاف اگر سوال میں بھونڈا پن اختیار کیا گیا تو جواب دینے والے پر اس کی حماقت واضح ہو جائے گی اور وہ ٹال مٹول سے کام لے گا۔

اللہ ربّ العزت ہم لوگوں کو نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق زندگی گذارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

پریشان حال لوگوں کی مدد کیجئے

محسن انسانیت، رحمت دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

”المسلم اخ المسلم لا یظلمه و لا یسلمه و من کان فی حاجة اخیه کان الله فی حاجته و من فرج عن مسلم کربة فرج الله عنه کربة من کربات یوم القیامة و من ستر مسلما ستره الله یوم القیامة“۔

(متفق علیه)

یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا دینی بھائی ہے، اس دینی اخوت کا تقاضا ہے کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان پر ظلم نہ کرے، اس کو کسی ہلاکت میں مبتلا نہ کرے اور نہ کوئی مسلمان کسی مسلمانوں کو اس کے دشمن کے ہاتھوں میں چھوڑے بلکہ اس دشمن کے مقابلہ پر اس کی مدد و اعانت کرے اور یاد رکھو جو شخص کسی مسلمان بھائی کی حاجت روائی کی سعی و کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالی اس کی حاجت روائی کرتا ہے، جو شخص کسی مسلمان بھائی کے کسی غم کو دور کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن غموں میں سے ایک بڑے غم سے نجات دے گا اور جو شخص کسی مسلمان بھائی کے عیب کو ڈھانکتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیب کو ڈھانکے گا۔

مظفر نگر اور شاملی کے حالیہ فساد و قتل عام نے آپ کے بے شمار بھائیوں، بہنوں اور بچوں کو بے یار و مددگار کر کے چھوڑ دیا ہے، لٹے پٹے اپنوں سے بچھڑے آپ کے بھائی اپنے ہی علاقے میں بے گھر بار ہو گئے ہیں۔ اللہ رب العزت کسی کو یہ دن نہ دکھلائے۔ انسانی، اخلاقی اور شرعی آپ کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے کہ آپ ہر طرح سے ان کی مدد و نصرت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، ان کے کھانے پینے، اوڑھنے بچھانے، دو

اعلاج اور رہنے سہنے کا انتظام کریں۔ دامے درمے قدمے سخنے بڑھ چڑھ کر ان کا تعاون کریں۔ اگر اللہ رب العزت نے آپ کو سکون کی دو روٹی نصیب کی ہے تو ایک روٹی خوش دلی سے اپنے ان پریشان حال بھائیوں کو کھلا دیجیے۔ اللہ رب العزت نے آپ کو کئی کئی بیگھے زمین کا مالک بنا رکھا ہے تو سو گز ہی کیوں نہ ہو اپنے ان بے مکان بھائیوں کو مکان بنانے کے لئے دیدیجئے۔ اللہ رب العزت نے آپ کو مال و دولت کی فراوانی نصیب کر رکھی ہے بینکوں میں آپ کے پاس روپیے ہیں، چند ہزار ان بھائیوں کی باز آبادکاری پر خرچ کر دیجیے۔ اللہ رب العزت نے آپ کو ڈاکٹر بنایا ہے یہ عہد کر لیجیے کہ ہمارا پریشان حال جو بھی بھائی میرے پاس علاج کے لئے آئے گا اس کا مفت علاج کروں گا۔ اللہ رب العزت نے آپ کو اولاد سے نوازا ہے، جن کی تعلیم و تربیت پر، رہن سہن پر آپ اپنی پوری کمائی خرچ کرتے ہیں، آپ کے اپنے ہی مسلم بھائیوں کے بہت سے بچے یتیم ہو گئے ہیں، بعض بچوں کے ماں باپ دونوں شہید کر دیئے گئے ہیں، بعض ایسے بچے بھی ہیں، جن کا پورا کا پورا خاندان تباہ ہو چکا ہے، ان یتیم بچوں کا اب کوئی پرسان حال نہیں ہے آپ آگے بڑھیئے اور کم سے کم ایک بچہ کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے ذمہ لیجئے اور اپنے بچوں کی طرح اس کی بھی پرورش کیجیے، نوجوان بچیاں جن کا سب کچھ لٹ گیا ہے، ان کی شادی کا نظم کیجئے، اپنے نوجوانوں کو آمادہ کیجیے کہ وہ ان بچیوں سے نکاح کر کے ان کے زخم پر مرہم رکھیں اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کریں۔

فسادیوں جن کا منصوبہ آپ کی نسل کشی اور آپ کو بے یار و مددگار کرنے کا تھا، ان کے منصوبے کو ناکام کرنے کی سب سے اچھی صورت یہی ہے کہ جو لوگ بچ گئے ہیں، آپ اپنے بھرپور تعاون سے ان کو دوبارہ ان کے قدموں پر کھڑا کر دیں اور ان کے بچوں کو تعلیم یافتہ بنا دیں۔ یاد رہے اگر ایک بچہ بھی بے یار و مددگار رہ گیا، ایک عورت بھی بھوکی پیاسی بغیر سایہ کے رہ گئی، ایک بچی کی بھی عصمت اس لئے لٹ گئی کہ اس کی عصمت کا کوئی محافظ نہیں تھا تو آخرت میں اللہ رب العزت آپ سے ضرور اس بارے میں باز پرس

کریں گے کہ میں نے تمہیں بے شمار اپنی نعمتوں سے نوازا تھا تم نے میرے پریشان حال بندوں پر ان نعمتوں میں سے کیا خرچ کیا۔

آپ اپنے اوقات کو فارغ کر کے ان لوگوں کی مدد کیجئے اللہ آپ کی مدد کرے گا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ"

(جو اپنے بھائی کے کام میں لگا رہتا ہے، اللہ اس کے کام میں لگا رہتا ہے۔)

اے مسلمانوں مرنے کے بعد نہ مال ودولت کام آئے گی اور نہ شان وشوکت، اگر کوئی چیز کام آنے والی ہے تو یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کئے ہوئے کام۔

اس لئے:

احسنوا ان اللہ یحب المحسنین

اچھائی کرو، بلاشبہ اللہ تعالی اچھائی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

دوسروں کے کام آیئے

میں اس کے کام کیوں آؤں، اس سے مجھے کیا لینا دینا، آج تک اس نے میرے ساتھ کون سا احسان کیا ہے، میں اس کے لیے اپنا پیسہ کیوں برباد کروں، اپنا وقت کیوں ضائع کروں، میرا اس سے کیا فائدہ، یہ یا اس جیسے جملے نہ ایک انسان کے شایانِ شان ہیں اور نہ تقاضائے انسانیت ہیں، خودغرضی اور مفاد پرستی کوئی اچھی صفت نہیں ہے۔

بے غرض فقط اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضا کے لیے دوسروں کے کام آنا، جان و مال کی قربانی پیش کرنا، احسان کرنا، ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا دراصل یہی انسان کا امتیاز ہے اور یہی وہ صفت ہے جو اسے دیگر حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔

بار بار اللہ ربّ العزت نے قرآن کریم میں اور نبی اکرم ﷺ نے احادیثِ مبارکہ میں اس جانب متوجہ فرمایا ہے اور اسے ایک پسندیدہ عمل قرار دیا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

''وَ اَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ''

(اور اچھائی کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ اچھائی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''من كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته'' (بخاری)

(جو اپنے بھائی کے کام میں لگا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے کام میں لگا رہتا ہے)

ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤمِنٍ كُرْبَةً مِّنه كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ يَّسَّرَ علىٰ معْسَرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَليهِ فِي الدُّنْيَا

وَالاٰخِرَةِ.(رواہ مسلم)

(جس نے کسی مومن سے اس کی دنیاوی تنگیوں میں سے کوئی تنگی دور کی اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کی تنگیوں میں سے ایک تنگی دور کرے گا، جس نے کسی تنگ دست پر آسانی کی اللہ اس کے لیے دنیاوآخرت میں آسانی فرمائے گا۔)

بیوی بچوں کی ضروریات کا خیال رکھنا، بھائی بہنوں اور والدین کے حقوق کو ادا کرنا، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک رکھنا ان کی ضرورتوں میں کام آنا، عام انسانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، کوئی بیمار ہے علاج کے لیے پیسے نہیں ہیں، فاقہ میں مبتلا ہے کھانے کا انتظام نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو دے رکھا ہے آپ اس کی مدد کیجیے۔ بیمار ہے ڈاکٹر کے یہاں کوئی لے جانے والا نہیں ہے آپ اسے اپنی گاڑی سے لے کر چلے جایئے، بیوہ عورت ہے سودا سلف بازار سے کوئی لانے والا نہیں ہے، آپ جارہے ہیں، اس کا بھی سامان لیتے آیئے، بارش کی وجہ سے پڑوسی کا گھر ٹپک رہا ہے، رہنے کی جگہ نہیں ہے، اپنے یہاں جگہ دے دیجئے، یا اس کا گھر بنوا دیجیے، یہ یا اس جیسے کام بظاہر تو معمولی ہیں لیکن یہی نہیں کہ اس سے آپ کا اللہ تعالیٰ کے یہاں مرتبہ بلند ہوگا، بلکہ معاشرے میں بھی آپ نیک نام ہوں گے، لوگ آپ کی دل سے قدر کریں گے اور ضرورت پر آپ کے کام بھی آئیں گے۔

دراصل اللہ رب العزت نے انسان کو اجتماعی زندگی کے لیے پیدا کیا ہے، اس لیے وہ فطرتاً اپنے مسائل زندگی کو حل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے تعاون اور مدد کا محتاج ہے۔ معاشرے کی مثال ایک انسانی بدن کی سی ہے، جس طرح انسان کا بدن ایسے مختلف اجزاء سے مرکب ہے، جن میں فطری تعلق پایا جاتا ہے، اور ہر ہر جز اپنے فرائض کو ادا کرتا رہتا ہے۔ اسی تعلق اور اپنے فرائض کی ادائیگی ہی کی بنیاد پر انسانی زندگی موقوف ہے، اگر اعضاء کا آپسی تعلق ختم ہوجائے، اور اجزاء اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے انحراف کرنے لگیں تو وجود انسانی باقی نہ رہے گا۔ اسی طرح معاشرہ بھی اپنے افراد سے مرکب

ہے اور معاشرہ کی بقا بھی اسی بات پر موقوف ہے کہ اس کے افراد کا آپسی تعلق مستحکم ومضبوط ہو اور ہر ایک فرد اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرے، ایک فرد کو کوئی تکلیف ہو تو دوسرا بھی محسوس کرے، ایک دوسرے کی مدد اور خیر خواہی کا جذبہ رکھے، دوسروں کی پریشانیوں میں ان کا ساتھ دے، دوسروں کے مصائب ومشکلات کو اپنی مصیبت سمجھے۔ اگر اس سے انحراف کیا گیا اور آپسی تعاون کا جذبہ نہ رہا تو معاشرہ ٹوٹ جائے گا اور ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔

خلاصہ یہ کہ دوسروں سے بھلائی کرنا اور انہیں نفع وفائدہ پہنچانا ایک ایسی اچھی خصلت ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو معاشرہ امن وآشتی اور محبت والفت کا گہوارہ بن جائے۔ اس لیے ایک مؤمن بلکہ ایک اچھا انسان بننے کے لیے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو اور ایک دوسرے کے کام آئے۔

اعلیٰ اخلاق وکردار اپنائیے

غیروں کو اپنا بنانے، اپنوں کو گرویدہ کرنے اور دشمنوں کو زیر کرنے کے حوالے سے اگر ہم سب سے کامیاب کسی نسخے کو استعمال کر سکتے ہیں تو وہ ہے حسن خلق، حسن خلق سے متصف انسان یہی نہیں کہ اپنی ذات کو غیروں کے سامنے ایک عمدہ آئیڈیل کے طور پر پیش کرتا ہے، بلکہ اس کے دل میں محبت کی تخم ریزی کر کے صلح اور امن وسلامتی کی شجر کاری کرتا ہے۔ اعلیٰ اخلاق وکردار، خوش روئی، مسکراہٹ کے دو بول اور اپنائیت کے احساس کے ذریعے آپ بڑے سے بڑے دشمن کے دل میں اپنے لیے جگہ بنا سکتے ہیں اور اس کے دل میں ہم دردی کا جذبہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، اس کے برخلاف ترش روئی، بداخلاقی، بھونڈا پن اور بے مروّتی اپنوں کو بھی بیگانہ بنا دیتی ہے۔

دنیا میں وہی لوگ کامیاب اور نیک نام رہے ہیں جنھوں نے حسن خلق کو اپنا شیوہ بنایا اور اس صفت سے اپنی ذات کو سنوارا اور مزین کیا۔ جس قدر بھی انبیاء ورسول مبعوث ہوئے تمام ہی یہی نہیں کہ اس صفت حمیدہ ومحمودہ سے متصف تھے، بلکہ اس کے داعی بھی تھے، اور اپنے اصحاب ومتبعین کو اس سے مزین دیکھنا بھی چاہتے تھے۔ خود ہمارے نبی اکرم ﷺ انتہائی خوش خلق، نرم اور رحم دل تھے۔ آپ ﷺ کے اخلاق کی بابت ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:

”لم یکن فاحشا ولا متفحشا. وقال: قال رسول اللہ ﷺ ان من اخیر کم احسنکم خلقاً“ (بخاری شریف: ۲/۱۸۹)

نبی اکرم ﷺ کو فحش گوئی کی عادت تھی اور نہ قصداً فحش گوئی کرتے تھے اور فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سب سے بہترین شخص وہ ہے جو سب

سے زیادہ بااخلاق ہو۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:

"سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن اکثر مایدخل الناس الجنة قال تقوی اللہ وحسن الخلق وسئل عن اکثر مایدخل الناس النار قال الفم والفرج" (ترمذی: ۲۱/۲)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب سے زیادہ کون سی چیزیں (یعنی کون کون سے اعمال) لوگوں کو جنت میں لے جائیں گے؟ آپ نے فرمایا اللہ سے ڈرنا اور حسن خلق۔ پھر آپ سے دریافت کیا گیا سب سے زیادہ کون سی چیز لوگوں کو دوزخ میں لے جائے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا منہ اور شرمگاہ۔

افسوس ہم مسلمانوں پر کہ اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اعلیٰ تعلیمات و اعلیٰ اخلاق کو پس پشت ڈال دیا ہے اور غیروں کی تعلیمات میں اپنے لیے راہِ نجات تلاش کر رہے ہیں، جو قوم اخلاق و کردار، صدق و امانت، ایفائے عہد و دیانت کے حوالے سے لوگوں کے لیے نمونہ تھی، آج وہی بداخلاقی، جھوٹ، فریب، دغا، لوٹ کھسوٹ اور خیانت وغیرہ اوصافِ رذیلہ میں مشہور ہوتی جارہی ہے۔ اور اسے احساس بھی نہیں کہ وہ پستی کی کس گھاٹی میں گر رہی ہے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی پیروی کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

معاشرے میں اچھائیوں کو فروغ دیں

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کسی ایک قوم، ایک ملک اور ایک خاندان کی طرف نہیں تھی، بلکہ آپ پورے عالم کے لیے اور عالم کے ایک ایک فرد کے لیے نبی رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اللہ رب العزت کا صاف اعلان ہے:

''وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝'' (الانبیاء:۱۰۷)

(اے پیغمبر! ہم نے آپ کو سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)

آپ ﷺ نے جہاں لوگوں کو اللہ رب العزت کا یہ پیغام سنایا کہ سب اللہ کے بندے ہو، صرف اسی کو معبود مانو اور اسی کے احکامات کی اطاعت کرو، وہیں آپ نے یہ بھی بتلایا کہ تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، کسی کو کسی پر کوئی برتری وفضیلت حاصل نہیں ہے، نہ گورے کو کالے پر، نہ عربی کو عجمی پر اور نہ مالدار کو غریب پر، انسان ہونے کے اعتبار سے تمام انسان برابر ہیں، ہاں فضیلت و برتری کی چیز تقویٰ اور اچھے اعمال واخلاق ہیں، جس کے اعمال اچھے ہوں گے، جو اعلیٰ اخلاق اختیار کرے گا، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ رکھے گا، ضرورت مندوں کے کام آئے گا، پڑوسیوں کے حقوق کا لحاظ رکھے گا، یتیموں کے سر پر دست شفقت پھیرے گا، بیواؤں کی خبر گیری کرے گا، وہی اچھا اور کامیاب انسان ہے۔

حسن سلوک کا حکم صرف مسلمانوں اور اہل خاندان ہی سے متعلق نہیں ہے کہ ہم صرف اپنے بال بچوں کے ساتھ، والدین اور اعزاء واقرباء کے ساتھ ہی اچھا برتاؤ رکھیں، بلکہ اس کا حکم عام ہے، ہمیں ہر انسان خواہ مومن ہو یا غیر مومن بلکہ ہر حیوان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس" (متفق علیہ)

(اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا) یہاں لفظ "الناس" فرمایا جو ہر شخص کو شامل ہے۔

ایسے ہے آپ ﷺ نے پڑوسیوں کے حقوق بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

و اللہ لا یؤمن و اللہ لا یؤمن و اللہ لا یؤمن قیل من یا رسول اللہ قال الذی لا یأمن جارہ بوائقہ. (بخاری و مسلم)

(خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں، خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں، خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں، صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ شخص جس کے پڑوسی اس کے شر سے محفوظ و مامون نہ ہوں) یہاں بھی پڑوسی کا لفظ عام ہے خواہ پڑوسی مومن ہو یا غیر مومن۔

علاوہ ازیں صحیح حدیث سے ثابت مشہور واقعہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس فاحشہ و بدکار عورت کے جنتی ہونے کی اطلاع دی جس نے پیاس سے تڑپ رہے ایک کتے کو پانی پلایا تھا اور اس کے برخلاف اس عبادت گزار عورت کے جہنم میں داخل ہونے کی اطلاع دی جس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا اور اسے کھانا پانی نہ دیتی تھی، جس کے نتیجے میں وہ بھوکی تڑپ کر مر گئی۔

یہ ہے سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہمارے نبی محمد عربی ﷺ کی تعلیم اور آپ کا اسوہ، جن کا ہم نام لیتے ہیں، جن پر ہمارا ایمان ہے اور جن کی تعلیمات پر عمل کرنے سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت نصیب ہوگی۔

ہم مجموعی طور پر اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں اور بار بار اپنی زندگی اور اپنے اعمال کا جائزہ لیں کہ ان تعلیمات پر آج ہمارا، ہمارے بچوں کا، ہمارے خاندان اور معاشرے کا کتنا عمل ہے۔ ہم دوسروں کے دکھ درد میں کتنے شرک ہوتے ہیں، کتنے مریضوں کی تیمارداری کرتے ہیں، کتنی بیواؤں کی خبر گیری کرتے ہیں، کتنے بوڑھوں اور اپاہجوں کا سہارا بنتے ہیں، کتنے یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں، اپنے پڑوسیوں

کے ساتھ ہمارا کیا برتاؤ ہے، ہم کب اس کے کام آتے ہیں، اس کے بہترین پڑوسی بن کر رہتے ہیں یا بدترین پڑوسی ۔ اپنے بچوں کے احوال کو دیکھیں جو محلے کے نکڑ پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہلٹر بازی کرتے کھڑے رہتے ہیں، آنے جانے والوں کے ساتھ ان کا کیا معاملہ رہتا ہے وہ لوگوں کے ساتھ اخلاق کا معاملہ کرتے ہیں یا انتہائی بداخلاقی کا۔

ہم نے دین کو صرف چند رسموں اور عبادتوں تک منحصر کر دیا ہے، اور اپنی بقیہ پوری زندگی کو آزاد سمجھ لیا ہے۔ جب کہ دین اسلام مکمل ایک ضابطۂ حیات ہے، ہر ہر موقع پر وہ ہمیں حسن اخلاق، حسن کردار اور حسن معاملہ کی تاکید کرتا ہے اور ایک مہذب، نیک، باعمل و باکردار انسان بن کر زندگی گزارنے کی تاکید کرتا ہے۔

ضرورت ہے کہ ہم اپنے احوال کا، اپنے معاشرے کے احوال کا اور اپنے بال بچوں کے احوال کا جائزہ لیں، اور معاشرے میں حسن اخلاق وحسن کردار کو عام کریں، نیز حسن اخلاق کے معاملے کو صرف اپنے اہل مذاہب ہی کے ساتھ متعلق نہ رکھیں بلکہ انسانیت کی بنیاد پر ہر انسان کے ساتھ نیک سلوک کرنے، ہر ضرورت مند کے کام آنے، ہر بے سہارا کا سہارا بننے کی کوشش کریں اور انسانی مساوات کو فروغ دینے کی کوشش کریں۔

نشہ خوری سے اپنی حفاظت کیجیے

نشہ آور کسی بھی چیز کا استعمال انسان کے دماغ، اس کی قوتِ فکر اور قوتِ عمل کو مختل کردیتی ہے، جس کے نتیجے میں پیش آنے والے احوال سے مقابلہ کی طاقت کمزور ہوجاتی ہے، اعضائے رئیسہ آہستہ آہستہ جواب دے جاتے ہیں، اچھے بُرے کی تمیز اور حلال و حرام کا فرق ختم ہوجاتا ہے اور ضروریات کا احساس باقی نہیں رہتا۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ نشے کے عادی ہوتے ہیں اگر انھیں کسی وجہ سے نشہ خوری کا موقع نہ ملے تو وہ بالکل پاگل ہوجاتے ہیں، بھوک کا احساس ختم ہوجاتا ہے، بیوی بچوں کی ضروریات سے بے پروائی ہوجاتی ہے اور نشہ کا غلبہ اس قدر تیز ہوجاتا ہے کہ کچھ ملے یا نہ ملے لیکن مطلوبہ نشے کی تکمیل کے لیے ہر ممکنہ کوشش کرتے ہیں اور نہ ملنے کی صورت میں دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بھی شرم نہیں کرتے۔

الحاصل نشہ ایک بُری عادت ہے جو یہی نہیں کہ نشہ خور کی صحت، اس کی دولت اور اس کی ذاتی زندگی کو برباد کرڈالتی ہے بلکہ اس کے گھر اور خاندان کو بھی تباہی کے دہانے پر پہنچادیتی ہے۔ کمائی کا ایک حصہ جب نشہ خوری میں بہادیا جاتا ہے تو اس کے اثرات سے روزمرہ کے گھریلو اخراجات، بیوی بچوں کی ضروریات اور اہل حقوق کے حقوق متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتے، جس کے نتیجے میں آپس میں بُعد اور اختلافات ہونے لگتے ہیں۔ چاہے وہ بیڑی، سگریٹ اور پان کا نشہ ہو یا شراب، بھنگ اور افیم کا۔

اسلام جو اعلیٰ اخلاق و کردار، صحت مند زندگی اور صحت مند معاشرے کی تعلیم دیتا ہے، نشے کو ناپسند کرتا ہے اور نشہ آور اشیاء کے استعمال سے مسلمانوں کو منع کرتا ہے۔ نشہ آور اشیاء میں سے بعض چیزیں مکروہ کے قبیل سے ہیں جیسے بیڑی، سگریٹ، حقہ، تمباکو

وغیرہ، جب کہ بعض چیزوں کا استعمال حرام ہے جیسے افیم اور شراب وغیرہ۔

حرام اشیاء میں سب سے زیادہ جس نشہ آور چیز کا استعمال عام ہوتا جارہا ہے اور جس نے اس وقت اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے بعض افراد کو بھی اپنی زد میں لے رکھا ہے وہ ہے شراب۔حرام ہونے کے باوجود ہمارے مسلم معاشرے کے بہت سے افراد اس کی لت میں مبتلا ہیں، اور اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت سے بے پرواہ ہوکر اپنی معمولی اور گاڑھی کمائی کو شراب نوشی میں لگادیتے ہیں، نتیجتاً نہ بیوی بچوں کے اخراجات کے لیے ان کے پاس رقم بچتی ہے اور نہ ان کی تعلیم وتربیت کی فکر ہوتی ہے، عورتیں اپنے اخراجات کی تکمیل کے لیے غلط راستے پر چل پڑتی ہیں، اور بچے بھی مادر پدر آزاد ہوکر نشہ خوری، عیاشی، چوری، غنڈہ گردی، جھگڑا لڑائی میں مبتلا ہوکر اپنی زندگی کو برباد کرڈالتے ہیں، اور پورے مسلم معاشرے کی بدنامی ورسوائی کا سبب بنتے ہیں۔شراب کے بے شمار نقصانات میں سے چندایک ملاحظہ ہوں:

بدنِ انسانی پر شراب کے مضرات یہ ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ معدے کے فعل کو فاسد کردیتی ہیں، کھانے کی خواہش کم کردیتی ہیں، چہرے کی ہیئت بگاڑ دیتی ہے، پیٹ بڑھ جاتا ہے، جب کہ مجموعی حیثیت سے تمام قویٰ پر یہ اثر ہوتا ہے کہ بقول ایک جرمن ڈاکٹر ''جو شخص شراب کا عادی ہو، چالیس سال کی عمر میں اس کے بدن کی ساخت ایسی ہوجاتی ہے جیسے ساٹھ سالہ بوڑھے کی۔'' شراب جگر اور گردوں کو خراب کردیتی ہے، سل کی بیماری شراب کا خاص اثر ہے، شراب کی یہ مضرت تو ہر شخص جانتا ہے کہ پینے کے بعد جب تک نشہ رہتا ہے عقل کام نہیں کرتی، لیکن اہل تجربہ اور ڈاکٹروں کی تحقیق یہ ہے کہ نشے کی عادت خود قوتِ عاقلہ کو بھی ضعیف کردیتی ہے جس کا اثر ہوش میں آنے کے بعد بھی رہتا ہے، بعض اوقات جنون تک اس کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔خون میں ہیجان پیدا کردیتی ہے جس سے وقتی طور پر قوت کی زیادتی محسوس ہونے لگتی ہے اور یہی خون کا دفعتاً ہیجان بعض اوقات اچانک موت کا سبب بھی بن جاتا ہے جس کو ڈاکٹر ہارٹ فیل ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔

شراب کا اثر انسان کے حلقوم اور تنفس پر بھی خراب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے آواز

بھاری ہوجاتی ہے، کھانسی دائمی طور پر آنے لگتی ہے، آخر کار سل تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔اس کا بُرا اثر نسل پر بھی پڑتا ہے، شرابی کی اولاد کمزور رہتی ہے اور بعض اوقات اس کا نتیجہ قطع نسل تک پہنچتا ہے۔

شراب کی یہ مضرتیں اور اس کے زہریلے اثرات دفعتاً ظاہر نہیں ہوتے، بلکہ وقتی طور پر تو انسان اپنے اندر ہیجان کی وجہ سے قوت محسوس کرتا ہے۔لیکن تدریجی طور پر کچھ عرصے بعد یہ سب مضرتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں اور پھر اس وقت افسوس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔شراب کا ایک بڑا تمدنی مفسدہ یہ ہے کہ یہ اکثر لڑائی جھگڑے کا سبب بنتا ہے اور پھر یہ بغض وعداوت دور تک انسان کو نقصان پہنچاتی ہے۔اسی طرح اس کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ مدہوشی کے عالم میں بعض اوقات انسان اپنے پوشیدہ راز کو بیان کر دیتا ہے، جس کی مضرت اکثر بڑی تباہ کن ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جس نے بھی عقل سلیم کے ساتھ اس کے مضر اثرات پر غور کیا وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ شراب انسان اور انسانی معاشرے کا قاتل ہے، اسے استعمال کرنے والا پاگل اور اپنی نسلوں کو تباہ و برباد کرنے والا اور انھیں پاگل بنانے والا ہے۔بطور نمونہ ایک انگریز قانون داں بنتام کا یہ جملہ ملاحظہ کیجیے:

''اسلامی شریعت کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شراب حرام ہے، ہم نے دیکھا کہ جب افریقہ کے لوگوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا تو ان کی نسلوں میں پاگل پن سرایت کرنے لگا، اور یورپ کے جن لوگوں کو اس کا چسکہ لگا ان کی بھی عقلوں میں تغیر آنے لگا۔(معارف القرآن ۱/ ۵۳۰)

الغرض شراب امّ الفواحش و امّ الخبائث ہے، انسانیت کی قاتل، عائلی و خاندانی زندگی کے لیے زہر اور معاشرے کی تباہی و بربادی کا ذریعہ ہے۔ ہر انسان کو اس سے بچنا چاہیے، چہ جائے کہ اپنے آپ کو اللہ و رسول کا تابع و فرماں بردار کہنے والا مسلمان اس کی لت میں مبتلا ہو۔ اللہ رب العزت ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے اور جو لوگ نشہ خوری میں مبتلا ہیں انھیں اس بُری عادت سے توبہ کی توفیق مرحمت فرمائے۔آمین

عفو و درگزر سے کام لیجئے

قلبی سکون اور ذہنی راحت کا حصول اس پر موقوف ہے کہ انسان تمام لوگوں سے صلح وصفائی رکھے اور دوسروں سے خلاف توقع ہونے والی غلطیوں کو بھی ایک حد تک درگزر کردے اور اس کا تحمل کرلے، کیوں کہ بہت سے ایسے مواقع ہیں جہاں مکمل صلح وصفائی اور درگزر کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ایک قسم کی بہادری وجواں مردی کا بہترین نمونہ عفو وبخشش ہے، جن لوگوں میں یہ فضیلت کافی مقدار میں پائی جاتی ہے، وہ قدرت کے باوجود دوسروں کی غلطیوں کو معاف کردیتے ہیں۔

قرآن کریم اپنے متبعین کو عفو درگزر کی ہی تعلیم دیتا ہے:

وَ لْيَعْفُوْا وَ لْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾. (نور:۲۲)

(چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان۔)

''وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ'' (آل عمران:۱۳۴)

(اور غصہ پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے۔)

دشمن کو تو ختم کیا جاسکتا ہے لیکن دشمنی اور عداوت کو غصہ، انتقام اور دشمنی کے ذریعہ ختم نہیں جاسکتا، اس لیے آتش غضب کو بجھانے اور دشمنی کو دوستی اور محبت سے بدلنے کا ایک ہی طریقہ ہے وہ ہے عفو درگذر۔اسی نکتے کی جانب قرآن اشارہ کرتا ہے:

وَ لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾. (حم سجدہ:۳۴)

نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی، آپ نیک برتاؤ سے (بدی کو) ٹال دیا کیجئے، پھر یکا یک (آپ دیکھیں گے کہ) آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے۔ دوسروں کی برائیوں اور زیادتیوں سے چشم پوشی کرنا اگر چہ فطرتاً بہت دشوار چیز ہے اور نفس بھی ابتداء میں اس پر تیار نہیں ہوتا، لیکن انسان جتنا جتنا اس صفت پر عمل کرتا جائے گا، اس کے باطن میں پیدا ہونے والے ہیجان کے بحران میں محسوس طریقہ سے کمی ہوتی جائے گی اور آخر کار وہ شخص عفو کنندہ بن جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ خداوند قدوس کا ایک ایسا بہترین عطیہ انسان کے پاس ہے، جو دیگر کسی حیوان کے اندر نہیں ہے اور وہ ہے دوسروں کی خطاؤں اور غلطیوں کو معاف کر دینا، جو شخص آپ کو اذیت دیتا ہو وہ آپ کو بہترین موقع دیتا ہے کہ آپ اس کو معاف کر کے لذت عفو سے ہم کنار ہو جائیں۔

ہمارے آقا رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہی تھی، جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کسی کو برا بھلا کہنے کی نہ تھی برائی کے بدلہ برائی نہیں کرتے تھے، بلکہ درگزر کرتے تھے اور معاف فرما دیتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی کا بیان ہے نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات مبارک کی بابت کسی سے انتقام نہیں لیا، جنگ احد میں کافروں نے نبی کے دانت توڑے، سر پھوڑا، حضور ﷺ ایک غار میں گر گئے، صحابہ نے عرض کیا آپ ان پر بددعا فرمائیے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں لعنت کرنے کے لیے نہیں بنایا گیا ہوں، خدا نے مجھے لوگوں کو بارگاہ خدا میں بلانے کے لیے بھیجا ہے، اس کے بعد یہ دعا فرمائی: اے خدا میری قوم کو ہدایت فرما وہ مجھے نہیں جانتے ہیں۔ (رحمۃ للعالمین)

کفار مکہ اکیس سال تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے نام لیواؤں کو ستاتے رہے، ظلم وستم کا کوئی حربہ ایسا نہ تھا جو انہوں نے خدائے واحد کے پرستاروں پر نہ آزمایا ہو، حتی کہ وہ گھر بار اور وطن تک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، لیکن جب مکہ فتح ہوا تو

اسلام کے یہ بدترین دشمن مکمل طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم وکرم پر تھے اور آپ کا ایک اشارہ ان سب کو خاک وخون میں ملاسکتا تھا،لیکن ہوا کیا؟ ان تمام جباران قریش سے جو خوف اور ندامت سے سر جھکائے سامنے کھڑے تھے، آپ نے پوچھا تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں،تو انہوں نے دبی زبان سے جواب دیا: اے صادق،اے امین !تم ہمارے شریف بھائی اور شریف برادرزادہ ہو؟ ہم نے تمہیں ہمیشہ نرم دل پایا ہے۔آپ نے فرمایا آج میں تمہیں وہی کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا،حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ“.

(یعنی تم پر کوئی الزام نہیں جاؤ آج تم سب آزاد ہو)

ایک مرتبہ ایک درخت کے نیچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے،تلوار شاخ سے لٹکادی،غورث ابن الحراث آیا،تلوار نکال کر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گستاخانہ جگایا اور بولا اب تم کو کون بچائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ۔وہ چکرا کر گر پڑا،آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار اٹھائی اور فرمایا اب تجھے کون بچا سکتا ہے؟ وہ حیران ہو گیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جاؤ میں بدلہ نہیں لیا کرتا اور اس کو معاف فرما دیا۔

میٹھی بولی بولئے

میٹھی بولی اور خوش کلامی کے ذریعہ آپ دشمن کے دل میں بھی محبت کی تخم ریزی کر سکتے ہیں، جب کہ درشت گوئی اور سخت روئی سے اپنے بھی بیگانے ہوجاتے ہیں۔ شیریں گفتار، نرم مزاج اور خوش کلام آدمی بہت فائدہ میں رہتا ہے، اسے عوام میں مقبولیت اور پذیرائی حاصل رہتی ہے، لوگ اس سے محبت کا معاملہ کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کو غنیمت تصور کرتے ہیں، جب کہ قینچی کی طرح زبان چلانے والے درشت گو سے ہر انسان پیچھا چھوڑانے ہی میں عافیت محسوس کرتا ہے۔

رہبر انسانیت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو یہی تعلیم دی ہے کہ جب بولیں تو اچھی بات بولیں یا خاموش رہیں، آپ کا ارشاد ہے:

"مَنْ کَانَ یُومِنُ بِاللّٰہِ وَ الْیَومِ الاٰخِرِ فَلْیَقُلْ خَیراً اَوْ لِیَصْمُتْ" (البخاری)

(جس شخص کا اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان ہو، اسے چاہئے کہ بھلی بات کرے یا خاموش رہے۔)

حضرت اسود بن اصرم المحاربی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

"اَوصِنِی:قال: هل تملک لسانک ؟قلت ما املک اذا لم املک لسانی؟قال فهل تملک یدک ؟قلت فما املک اذا لم املک یدی؟ قال فلا تقل بلسانک الا معروفاً ولا تبسط یدک الا الی خیر" (الطبرانی)

(مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تو اپنی زبان پر قابو رکھتا ہے؟ میں نے عرض کیا اگر اپنی زبان پر بھی قابو نہیں رکھوں گا تو پھر کس چیز پر رکھوں

گا؟ فرمایا کیا تو اپنے ہاتھ پر قابو رکھتا ہے؟ میں نے عرض کیا اگر اپنے ہاتھ پر قابو نہیں رکھتا تو پھر کس پر رکھوں گا؟ فرمایا اپنی زبان سے بھلائی کے سوا کچھ نہ کہو اور اپنے ہاتھ کو نہ پھیلا مگر صرف بھلائی کی طرف۔)

طبرانی نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ان سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"انک لن تزال سالما ما سکتَّ فاذا تکلّمت کُتب لک او علیک."

(تو جب تک خاموش رہے گا سالم و محفوظ رہے گا اور جب بولے گا تو یا تیرے لیے نیکی لکھی جائے گی یا تجھ پر گناہ۔)

مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں تو استقامت لسان کو اصل ایمان قرار دیا گیا ہے، چناں چہ ارشاد ہے:

"لا یستقم ایمان عبد حتیٰ یستقیم قلبه ولایستقیم قلبه حتی یستقیم لسانه."

(کسی بندے کا ایمان اس وقت تک مستقیم نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا دل مستقیم نہ ہو جائے اور دل اس وقت تک مستقیم نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی زبان مستقیم نہ ہو۔)

نیز صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رسول اکرم ﷺ کا ارشاد اس طرح مروی ہے:

"ان الرجل لیتکلم بالکلمة من رضوان الله لایلقیٰ لها بالًا یرفعه الله بها درجات وان العبد لیتکلم بالکمة من سخط الله لایلقیٰ بها بالاً یهوی بها فی جهنم."

(کبھی آدمی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی کوئی ایسی بات کر لیتا ہے جس کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا، لیکن اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس شخص کے درجات بلند کر دیتے ہیں اور کبھی اللہ کے غضب و غصہ کی کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہے جس کی وہ کوئی پرواہ نہیں کرتا، لیکن اسی کے

سبب سے وہ جہنم کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔)

ان روایات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لایعنی باتیں اور درشت گوئی کس قدر دنیا وآخرت دونوں اعتبار سے ہلاکت خیز ہیں، مؤمن مخلص کو چاہیے کہ بھلائی کی بات کرے یا پھر خاموش رہے، اور فضول ولایعنی کلام سے اپنے آپ کو بچائے رکھے۔

قناعت اختیار کیجئے

کائنات اور کائنات کی تمام چیزیں اللہ رب العزت کی ملک ہیں اور ہم خود بھی اسی کے غلام اور بندے ہیں، ہماری تخلیق کا مقصد اصلی اللہ تعالی کی عبادت وطاعت ہے اور کائنات کی چیزیں ہماری ضروریات کی تکمیل کے لیے ہیں۔ دنیا کی حیثیت بس اتنی ہی ہے کہ انسان کو خالق کی عبادت وریاضت کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہو وہ انہیں حاصل کر لے، ان سے نفع اٹھائے، قوت حاصل کرے، اور پھر عبادت میں مشغول ہوجائے۔ گویا دنیا اور اسباب دنیا مقصود ومطلوب نہیں بلکہ اشیائے ضروریہ میں سے ہیں بقدر ضرورت استعمال کیا جائے بس۔

قناعت یہی ہے کہ احکام خداوندی پر عمل کرتے ہوئے بسہولت اسباب دنیا میں سے جو کچھ میسر ہوجائے اسی کو کافی سمجھے اور حرام مال کے چکر میں اسی طرح بہت زیادہ دولت جمع کرنے کی فکر میں نہ پڑے، دنیا میں رہ کر بھی دنیا سے دل نہ لگائے، اس کو مقصود ومطلوب نہ سمجھے، جس قدر ضرورت ہو حاصل کرے، اپنے پاس رکھے، بقیہ دوسروں کی ضرورت میں خرچ کردے۔ اور دسروں کے پاس جو مال ودولت ہے اس کی طرف للچائی نظروں سے نہ دیکھے، بلکہ اللہ تعالی نے جو کچھ دولت اسے عطا کر رکھی ہے اسی پر قانع رہے۔

کامل انسان وہ ہے جس کے دل کی دنیا اس دنیائے فانی اور اس کی ہر چیز سے بے رغبت وبے نیاز ہو، اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس سے زیادہ اسے اس چیز پر یقین ہو جو اس کے آقا ومالک ذات باری کے پاس ہے۔ جسے یہ نعمت نصیب ہوجائے وہ خالق کے یہاں بھی محبوب بن جاتا ہے اور مخلوق کے یہاں بھی، اور اگر انسان اس سے محروم رہے تو وہ ایک انمول دولت اور بے مثال خزانے سے محروم ہے، کیوں کہ اس کے بغیر انسان کے دل کی کائنات، دنیا کی محبت اور اس کے جھنجھٹ میں الجھ کر رہ جائے گی۔ روایت ہے کہ

جب ابو حازم الزاہد سے پوچھا گیا:

''ما مالک؟قال: الثقة باللہ و الیاس مما فی ایدی الناس''.

آپ کا مال کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا (میرے پاس دو ایسے مال ہیں جن کی بناء پر فقر وافلاس سے ہمیشہ محفوظ ہوں، ایک) اللہ پر اعتماد، اور (دوسرا) لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے مایوسی و ناامیدی۔

الحاصل قناعت ایک ایسی صفت محمودہ ہے کہ اگر انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو یہی نہیں کہ اس کا تعلق اللہ تعالی سے انتھائی مضبوط و مستحکم ہو جاتا ہے، بلکہ مخلوق کی نظروں میں بھی محمود و مقبول ہوتا ہے۔ حضرت ابو العباس سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

''یَا رَسُولَ اللّٰہِ دُلَّنِیْ علٰی عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُہُ اَحَبَّنِیَ اللّٰہ وَ اَحَبَّنِیَ النَّاسُ۔ فَقَالَ: اَزْھَدْفِی الدُّنْیَا یُحِبُّکَ اللّٰہُ وَ اَزْھَدْ فِیمَا عِنْدَالنَّاسِ یُحِبُّکَ النَّاسُ.'' (ابن ماجہ)

(اے اللہ کے رسول مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جس کے کرنے پر اللہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگے اور لوگ بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''دنیا سے بے رغبت ہو جا تو اللہ تجھے محبوب بنا لیں گے اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیاز ہو جا تو سب لوگ تجھ سے محبت کرنے لگیں گے۔)

پہلے وصف پر انسان خالق کا محبوب بن جائے گا اور دوسری صفت پر لوگوں کے نزدیک یعنی خالق اور مخلوق کے یہاں خاص محبت و عظمت کے شرف سے مشرف ہو جائے گا اور ظاہر ہے جس عمل کے اختیار کرنے سے انسان خالق اور مخلوق دونوں کے یہاں محبوب و معزز قرار پائے اس عمل کی عظمت و اہمیت محتاج بیان نہیں۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: دنیا سے بے رغبتی موٹا کھانے اور چیتھڑے پہننے کا نام نہیں، بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ دنیاوی امیدوں کو کم کر دے۔ بہر حال جب دل کی دنیا قناعت، توکل اور زہد کی حقیقت و نور سے منور و مالا مال ہو تو

انسان کے لیے اس دنیا میں بھی رہنا رحمت کا باعث بن جاتا ہے اور آخرت کی نعمائے جنت کا بھی حق دار ٹھہرتا ہے۔

حضرت حسنؒ فرماتے ہیں: دنیا مومن کے لیے بہترین گھر ہے کہ اس میں آخرت کے لیے کمائی کرتا ہے اور نیت کی اصلاح پر ہر کام پر ثواب ملتا ہے اور دنیاوی کام بھی اس کے لیے نیکی بن جاتے ہیں اور اسے کھانے پینے اور سونے جاگنے جیسے مباح امور پر بھی ثواب ملتا ہے۔

قناعت اور زہد جیسی نعمت جب کسی بندۂ خدا کو نصیب ہو جائے تو وہ خالق کے یہاں بھی محبوب بن جاتا ہے اور مخلوق کے یہاں بھی، اگر انسان اس سے محروم ہو جائے تو وہ ایک انمول دولت اور بے مثال خزانے سے محروم ہو گیا، کیوں کہ اس کے بغیر انسان کے دل کی کائنات، دنیا کی محبت اور اس کے جھنجھٹ میں الجھ کر رہ جائے گی۔

جیسا کہ حضرت جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے:

"حب الدنيا راس كل خطيئة."

(دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔)

حضرت کعب الاحبار سے جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مجلس میں حضرت عبد اللہ بن سلام نے یہ سوال کیا کہ:

"علم والے کون ہوتے ہیں؟"

تو آپ نے جواب دیا:

"جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتے ہیں"۔

پھر پوچھا کہ جاننے بوجھنے اور پڑھنے سیکھنے کے بعد کس چیز نے علماء کے دل سے نور علم ضائع کر دیا؟ تو فرمایا:

"طمع، لالچ اور اس امر نے کہ وہ اپنی حاجتیں لوگوں سے مانگنے لگے"۔

الحاصل دنیا سے بے رغبتی اور دنیا والوں سے بے نیازی محبوبیت اور سروری وسرداری کا نسخہ کیمیا ہے۔ جس نے اسے حاصل کر لیا اس نے دنیا وآخرت دونوں جہاں میں کامیابی حاصل کر لی۔

معاشرے میں سچ کو فروغ دیجئے

مسلم معاشرے کا یہ امتیاز تھا کہ اس میں سچائی کا بول بالا تھا، اور جھوٹ سے لوگ نفرت کرتے تھے۔ لیکن افسوس آہستہ آہستہ جھوٹ کی نفرت اور سچائی کا جذبہ دلوں سے نکلتا چلا گیا اور مسلمان بھی غیروں کی طرح دین وشریعت سے آزاد زندگی گزارنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ سچ معاشرے میں انسان کو وقار وعظمت عطا کرتا ہے، شجر محبت والفت کی آبیاری کرتا ہے، آپسی اعتماد ووقار کو بحال کرتا ہے، اور معاشرے کے بندھن کو مضبوط کرتا ہے۔ سچائی ہی اچھائی ہے، اور سچ ہی میں نجات ہے۔

ملاحظہ ہو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک:

”تحروا الصدق وان رأیتم ان الھلکۃ فیہ فان فیہ النجاۃ“.

(الترغیب والترھیب)

(سچ کو تلاش کرو، اگرچہ تمہیں اس میں ہلاکت معلوم ہو، اس لیے کہ نجات (اسی سچ بولنے) میں ہے۔)

ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے نے: آپ مجھے کوئی نصیحت فرمائیں: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جھوٹ چھوڑ دو اور ہمیشہ سچ بولا کرو۔ وہ شخص جواب پا کر چلا گیا، اس کے بعد اس نے کہا: میں بہت ہی گنہگار تھا، لیکن میں ان گناہوں کے چھوڑنے پر مجبور ہو گیا، کیوں کہ گناہ کرنے کے بعد اگر مجھ سے پوچھا جاتا اور میں سچ بول دیتا تو سب کے سامنے رسوا ہو جاتا اور لوگوں کی نظروں سے گر جاتا اور اگر جھوٹ بولتا تو دستور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتا اس لیے میں نے تمام گناہ چھوڑ دیئے۔

اس کے بالمقابل جھوٹ ایک بدترین صفت ہے، جو افراد اس کا شکار ہوتے ہیں، یہی نہیں کہ لوگوں کی نظروں میں ان کی کوئی حیثیت نہیں رہتی، ان کی باتوں پر اعتماد نہیں کیا

جا تا، بل کہ ان کا دل بھی چور رہتا ہے اور وہ ہر وقت اپنے جھوٹ کو چھپانے کی فکر میں پریشان رہتے ہیں۔

سچائی کی خوبیوں اور جھوٹ کی ہلاکت خیزیوں کو بیان کرتے ہوئے ایک موقعہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَاِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِى الىٰ البِرِّ وَاِنَّ البِرَّ يَهْدِىْ الىٰ الجَنَّةِ وَمَا يَزَال الرَّجُلُ يَصْدِقُ وَيَتَحَرىَّ الصِّدْقَ حتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيقاً وَاِيَّاكُمْ وَالْكِذْبَ فَاِنَّ الْكِذْبَ يَهْدِىْ الىٰ الْفُجُورِ وَ اِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِىْ الىٰ النَّارِ وَمَا يَزَال الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرىَّ الْكِذْبَ حتىّٰ يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذّٰابًا". (متفق عليه)

(سچ بولنے کو اپنے اوپر لازم کرلو، کیوں کہ (ہمیشہ اور پابندی کے ساتھ) سچ بولنا، نیکوکاری کی طرف لے جاتا ہے (یعنی سچ بولنے کی خاصیت یہ ہے کہ نیکی کرنے کی توفیق ہوتی ہے) اور نیکوکاری (نیکوکار کو) جنت کے (اعلیٰ درجات) تک پہنچاتی ہے اور (یاد رکھو) جو شخص ہمیشہ سچ بولتا ہے اور ہمیشہ سچ بولنے کی سعی کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے۔ اورتم اپنے آپ کو جھوٹ بولنے سے باز رکھو، کیوں کہ جھوٹ بولنا فسق وفجور کی طرف لے جاتا ہے (یعنی جھوٹ بونے کی خاصیت یہ ہے کہ برائیوں اور بدعملیوں کے ارتکاب کی طرف رغبت ہوتی ہے) اور فسق وفجور (فاسق وفاجر کو) دوزخ کی آگ میں دھکیلتا ہے۔ (یادرکھو) جو شخص بہت جھوٹ بولتا ہے اور (زیادہ سے زیادہ) جھوٹ بولنے کی سعی کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی یہاں کذاب یعنی بڑا جھوٹا لکھا جاتا ہے۔)

دراصل زبان احساسات باطنی کی ترجمان اور رازہائے سربستہ کو ظاہر کرنے والی ہے۔ جھوٹ اگر عداوت وحسد کی بناپر ہوتو خطرناک غصہ کا نتیجہ ہوتا ہے اور اگر طمع ولالچ یا بربنائے عادت ہوتو انسان کے اندر بھڑکتے ہوئے جذبات کا نتیجہ ہے۔ اگر زبان جھوٹ سے آشنا ہوگی اور گفتگو میں جھوٹ نمایا ہوگیا تو جھوٹ بولنے والے کی عظمت اس طرح ہَوا ہوجاتی ہے جیسے موسم خزاں میں درخت کے پتے۔ جھوٹ انسان کی ناپاکی وخیانت کی

روح کو تقویت دیتا ہے اور ایمان کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو خاموش کر دیتا ہے۔ جھوٹ رشتۂ الفت واتحاد کو توڑ دیتا ہے اور عداوت ونفاق کے بیج معاشرے میں بو دیتا ہے۔

گمراہوں کا زیادہ تر حصہ جھوٹے وعدوں اور خلاف واقع گفتگو کا نتیجہ ہوتا ہے، بُرے لوگ اپنے فاسد مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنی شیریں بیانی اور کذب لسانی سے سادہ لوح حضرات کو وقتی طور سے اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں اور اپنی رطب اللسانی کی زنجیر میں اسیر کر لیتے ہیں۔ جھوٹا آدمی کبھی یہ سوچتا ہی نہیں کہ کوئی دوسرا اس کے راز پر مطلع ہو جائے گا، اسی اطمینان کی بنیاد پر وہ اپنی گفتگو میں غلطیوں اور تناقض کا شکار ہوتا رہتا ہے اور کبھی شدید رسوائی سے دوچار ہو جاتا ہے، اسی لیے یہ مثل بے بنیاد نہیں: ''دروغ گورا حافظہ نہ باشد''۔

قرآن شریف صریحی طور پر جھوٹ بولنے والوں پر لعنت بھیجتا ہے:

''فنجعل لعنة اللہ علی الکاذبین'' (آل عمران)

(پس لعنت کریں اللہ کی ان پر جو کہ جھوٹے ہیں)

اللہ تعالیٰ ہم سب کی جھوٹ سے حفاظت فرمائے اور معاشرے میں سچ کو فروغ دینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

دوسروں کی ٹوہ سے گریز کیجئے

ہم لوگوں کا عجیب حال ہوگیا ہے کہ ہمیں دوسروں کی فکر تو رہتی ہے کہ فلاں کیا کرتا ہے، کیا کھاتا ہے، کن لوگوں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے، لیکن اپنے اور اپنے بچوں کے احوال سے غافل رہتے ہیں، حالاں کہ اپنے احوال کا جائزہ اور اپنے بچوں کی خبر گیری ہی اصلاً ہماری ذمہ داری ہے۔ دوسروں کے احوال کی ٹوہ ہمیں نقصان تو پہنچا سکتی ہے لیکن مفید نہیں ہوسکتی۔

عموماً دوسروں کی ٹوہ اور ان کی لغزشوں کی تلاش کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ کچھ کمزوریاں اگر ہاتھ آجائیں تو اس کا مذاق اڑائیں، اور معاشرے میں اسے رسوا کریں۔ حالاں کہ ایسے لوگ خود عیوب کا مجسمہ ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اپنے عیوب سے غافل ہو کر دوسروں کے عیوب کو تلاش کرتے ہیں۔ یہ ایسی منحوس صفت ہے جو انسان کی زندگی کو آلودہ کر دیتی ہے اور اس کی اخلاقی شخصیت کو گرا دیتی ہے۔

انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے، اس کی ذات میں بہت سی کمزوریاں ہیں، لیکن اس کی غیرت اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ کوئی اس کی کمزوریوں پر مطلع ہو، اور اگر ہو جائے تو کسی کو مطلع کرے۔ اسلام نے اس کی اس غیرت کا بھرپور لحاظ رکھا ہے اور عیب جوئی و پردہ دری کو جو تفرقہ کا سبب اور دوستانہ روابط کے قطع کرنے کا سبب ہے، ممنوع قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيْراً مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا''(الحجرات)

(اے ایمان والو بہت سے گمان سے بچا کرو، کیوں کہ بعض گمان گناہ ہوتے

ہیں اور (کسی کے عیب کا) سراغ نہ لگایا کرو۔)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

"مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ." (متفق علیہ)

(جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔)

روایت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھائی کی ستر پوشی کرنے والے یا اس کے عیوب کو چھپانے والے شخص نے دنیا میں جو عیوب و گناہ کئے ہوں گے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے گناہ و عیوب کی پردہ پوشی کرے گا، بایں طور کہ ان کو اہل موقف کے سامنے ظاہر نہیں کرے گا، اس پر مواخذہ ومحاسبہ نہیں کرے گا اور نامۂ اعمال کی پیشی کے وقت ان کا ذکر پوشیدہ طور پر ہوگا۔

ایک موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من ستر عورة اخيه المسلم ستره الله عورته يوم القيامة و من كشف عورة اخيه المسلم كشف الله عورته حتى يفضحه بها فى بيته" (ابن ماجہ)

(جس نے اپنے مسلمان بھائی کے چھپے ہوئے عیب کی پردہ پوشی کی اللہ رب العزت قیامت کے دن اس کے پوشیدہ عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا اور جس نے اپنے مسلمان بھائی کے پوشیدہ عیوب کو ظاہر کیا اللہ رب العزت اس کے عیوب کو ظاہر کردے گا اور اس کو اس کے گھر میں رسوا کردے گا۔)

جن مسلمانوں کے عیوب کی پردہ پوشی لازم وضروری ہے وہ اس درجہ کے مسلمان ہیں جن کو اہل عزت وحیا کہا جاتا ہے یعنی وہ مسلمان جن کی ظاہری زندگی پاکیزہ اور آبرو مندانہ سمجھی جاتی ہے اور جن کے عیوب پوشیدہ رہتے ہیں کہ اگر بتقضائے بشریت ان سے کوئی گناہ وعیب سرزد ہوجاتا ہے تو وہ اس کی پردہ پوشی کرتے ہیں اور آئندہ کرنے سے بچتے ہیں۔

رہے وہ مسلمان جو حیا کا پردہ اٹھا دیتے ہیں، ان کی ایذاء رسانی اور فتنہ پردازی آشکارا ہوتی ہے، علی الاعلان گناہ و معصیت کا ارتکاب کرنے میں کوئی شرم اور جھجک محسوس نہیں کرتے، ان کا معاملہ جداگانہ ہے۔ ایسے لوگوں کے شر سے بچنے کے لیے اور دوسرے لوگوں کو بچانے کے لیے ان کی غلط نقل وحرکت پر نظر بھی رکھی جائے گی اور لوگوں کو مطلع بھی کیا جائے گا۔

بھائی بھائی بن کر رہو

تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، اور آدم علیہ السلام کا خمیر مٹی ہے، انسان ہونے کی حیثیت سے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں، کوئی برتری نہیں، سب انسان ہیں، ایک ماں باپ سے ہیں، سب کی تخلیق مٹی سے ہے، اس لیے سب برابر ہیں، سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، سب میں مساوات اور یکسانیت ہے۔ کسی کو حقیر سمجھنا، کمتر سمجھنا، ذلیل ورسوا کرنا، یہ درحقیقت انسانیت سے نکل جانا ہے۔ محسن انسانیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تو یہ ہے:

”کُونُوْا عِبَادَاللّٰہِ اِخْوَاناً، اَلْمُسْلِمُ اَخُوْ الْمُسْلِمِ، لَایَظْلِمُہٗ وَلَا یَکْذِبُہٗ، وَلَا یَحْقِرُہٗ اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا، یُشِیْرُ اِلٰی صَدْرِہٖ (ثَلٰثُ مَرَّاتٍ) بِحَسْبِ امْرِیئٍ مِنَ الشَّرِّ اَنْ یَحْقِرَ اَخَاہُ الْمُسْلِمِ، کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلٰی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، دَمُہٗ وَمَالُہٗ وَعِرْضُہٗ. (رواہ مسلم)

تم سب آپس میں بھائی بھائی اور اللہ کے بندے بن کر رہو، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، پس نہ اس پر زیادتی کرے، نہ جھوٹ بولے اور نہ ہی اسے حقیر اور گھٹیا جانے، تقویٰ اور پرہیز گاری تو یہاں ہے، اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین بار یہ ارشاد فرمایا، کسی بھی انسان کی برائی کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے، مسلمان پورے کا پورا دوسرے مسلمان پر حرام ہے، یعنی اس کا خون، مال اور اس کی عزت، سب کچھ۔

اس حدیث شریف میں بنیادی طور پر اسلامی اخوت و بھائی چارہ کی تعلیم وتاکید کی گئی ہے اور ان چیزوں سے روکا اور منع کیا گیا ہے جو اس میں خلل انداز ہوتی اور خرابی

وفساد کا ذریعہ و باعث بنتی ہیں۔

پہلی بات جو اس میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ سب اللہ کے بندے اور اس کے پیدا کئے ہوئے ہو، اور آپس میں بھائی بھائی ہو، اس لیے تمہیں ایسی تمام باتوں سے بچ کر رہنا چاہئے جو تمہاری اخوت اور باہمی تعلق داری کے خلاف ہوں بلکہ ان کاموں کو اپنا شعار بناؤ جو تمہارے باہمی تعلقات میں اضافے اور ان کی تقویت کا باعث بن سکیں، مثلاً:

سلام کا جواب دینا، چھینکنے والے کے ''**الحمد لله**'' کہنے پر ''**یرحمك الله**'' کہنا، مریض کی عیادت کرنا، جنازہ کے ساتھ چلنا، دعوت قبول کرنا، ملاقات کے وقت سلام سے آغاز کرنا اور ہر حال میں دوسرے کی خیر خواہی کرنا وغیرہ وغیرہ۔

یہی وہ مقصد ہے جس کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''**تهادّوا تحابّوا**''

یعنی آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو تا کہ محبت میں اضافہ ہو۔

دوسری روایت میں آپ کا ارشاد ہے:

''کیوں کہ ہدیہ دل کی میل کچیل کو دور کر دیتا ہے''۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے ایک مرفوع حدیث اس مضمون کی منقول ہے:

''**المصافحة تزيد في المودة**''

مصافحہ محبت میں اضافے کا باعث ہے۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں:

''جب دو مسلمان آپس میں خندہ پیشانی سے ملتے اور مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے گناہ اس طرح گرتے ہیں جس طرح درخت کے پتے''۔

بہر حال اس ارشاد گرامی میں ان امور کی ترغیب دی گئی ہے جو باہمی الفت و محبت اور اخوت و بھائی چارگی میں اضافے اور تقویت کا باعث ہیں کیوں کہ اخوت اسلامیہ

بڑی اہم شئ ہے۔

اسی لیے آگے ارشاد فرمایا:

''ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے پس نہ تو وہ اس پر ظلم کرے نہ اسے بے یارومددگار چھوڑ دے، نہ اس سے جھوٹ بولے اور نہ ہی اسے حقیر جانے''

مسند احمدؒ میں حضرت نو اس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''یہ بڑی ہی خیانت ہے کہ تو اپنے بھائی سے کوئی ایسی بات کہے جسے وہ سچا سمجھتا ہو اور تو اس میں جھوٹا ہو''۔

یعنی یہ بڑا دھوکہ اور خیانت ہے کہ وہ تو آپ پر اعتماد کر کے آپ کی بات کو سچا سمجھتا ہو اور آپ اس سے جھوٹ کہہ رہے ہوں۔

دوسری بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینۂ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمائی کہ: ''تقویٰ تو یہاں ہے''، یعنی تقویٰ و پرہیز گاری کا اصل تعلق دل سے ہے، دل میں خدا کا خوف ہونا چاہیے، صرف ظاہر داری سے کچھ نہیں بنے گا، جیسا کہ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے:

''فانھا من تقوی القلوب''

یہ تو دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔

ایک روایت میں آپ کا ارشاد منقول ہے:

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نہ تو تمہاری شکلوں صورتوں کو دیکھتا ہے نہ ہی تمہارے مالوں کو بلکہ وہ تو صرف تمہارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے''۔

یعنی شکل وصورت اور مال ودولت کے اعتبار سے آدمی کیسا ہی کیوں نہ ہو، اللہ تعالی کے یہاں اصل مقام ومعیار دل کی نیت اور عمل کی پونجی کا ہے۔

تیسری اہم بات آپ نے اس روایت میں یہ ارشاد فرمائی کہ آدمی کے شر اور اس کی برائی کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔

یعنی یہ اتنی بڑی برائی ہے کہ اس کے بعد اسے کسی اور برائی کی ضرورت نہیں کیونکہ دوسرے کی تحقیر دراصل تکبر سے پیدا ہوتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور دوسرے کو اپنے سے کمتر اور گھٹیا، اور یہ بات معلوم ہے کہ تکبر سب سے بڑی برائی ہے۔ تکبر کے معنی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح بیان کئے ہیں:

''الکبر بطر الحق و غمط الناس''

یعنی تکبر کہتے ہیں حق کے انکار کرنے اور لوگوں کو گھٹیا جاننے کو۔

آخر میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر ہر طرح سے حرام (اور قابل احترام) ہے، جان و مال کے اعتبار سے بھی اور عزت وآبرو کے لحاظ سے بھی، نہ اس کی جان و مال میں کوئی ہاتھ ڈال سکتا ہے اور نہ اس کی عزت وآبرو کو کوئی چھیڑ سکتا ہے۔

اسی بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے اپنے مقدس و شاہ کار خطبہ میں مزید تاکید سے اس طرح ارشاد فرمایا:

''تمہاری جان و مال اور عزت وآبرو اسی طرح حرام ہے جس طرح آج کا یہ دن (یوم عرفہ) اس مقدس شہر (مکہ مکرمہ) اور اس مبارک مہینہ (ذوالحجہ) میں''۔

پھر سامعین کو حکم فرمایا کہ یہ پیغام:

''شاہد غائب کو پہنچادے''۔ یعنی جو لوگ مجھ سے براہِ راست سن رہے ہیں وہ میرا یہ پیغام ان لوگوں تک پہنچادیں جو یہاں موجود نہیں یا آئندہ آئیں گے۔

الغرض ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت اور عزت وآبرو کی پاس داری اسی طرح لازم ہے، جس طرح انسان اپنے حقوق کے حصول کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ ایک دوسرے سے بھائی کی طرح مل جل کر رہیں اور آپس میں عداوت و دشمنی کو پیدا نہ ہونے دیں۔

زبان کو قابو میں رکھیئے

بے تکی باتیں، اوٹ پٹانگ بکواس، گالم گلوچ، فحش گوئی ایسی چیزیں ہیں جو بظاہر تو بڑی نہیں محسوس ہوتیں، لیکن ان کی وجہ سے بعض وقت دنیاوی اعتبار سے بھی بہت سے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں اور آخرت کے اعتبار سے تو نقصان دہ ہیں ہی۔ اکثر ایسی ہی باتوں سے آپس میں لڑائیاں ہوتی ہیں، جو بعض مرتبہ خطرناک صورت اختیار کرلیتی ہیں، اور باتوں ہی باتوں میں بعض مرتبہ منہ سے ایسے کلمات نکل جاتے ہیں جو کفر تک پہنچا دیتے ہیں۔

اس لئے اسے کنٹرول میں رکھنا اور سوچ سمجھ کر بولنا ضروری ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت تاکید فرمائی ہے اور اس کے نقصانات سے اپنی امت کو آگاہ فرمایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

”مَنْ یَضْمَن لِیْ مَا بَیْنَ لِحْیَیْهِ وَ مَا بَیْنَ رِجْلَیْهِ اَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ“.

(بخاری شریف)

جو شخص مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ اپنی اس چیز کی حفاظت کرے گا جو اس کے دونوں کلوں کے درمیان ہے (یعنی زبان اور دانت) اور جو اس کے دونوں پاؤں کے درمیان ہے (یعنی شرمگاہ) تو میں اس کی جنت کی ضمانت لیتا ہوں۔

زبان کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھے بایں طور کہ اس کو بے فائدہ الفاظ و کلام اور فحش گوئی و سخت کلامی سے محفوظ رکھے، طعن و تشنیع، غیبت و چغل خوری سے اجتناب کرے اور دانت کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ اس کو حرام چیزوں کے کھانے پینے میں ملوث نہ کرے، اسی طرح شرم گاہ کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ زنا اور لواطت جیسی برائیوں سے اجتناب کرے۔

واضح رہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ضمانت دراصل حق تعالی کی طرف سے ضمانت ہے کہ جس طرح وہ محض اپنے فضل وکرم سے بندوں کے رزق کا ضامن ہوا ہے، اسی طرح اس نے پاکیزہ زندگی اختیار کرنے، اعمال صالحہ پر جزا دینے اور اپنے انعامات سے نوازنے کا بھی قوی وعدہ کیا ہے اور چوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالی کے رسول اور پیغمبر ہیں اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالی کی طرف سے مذکورہ ضمانت لی۔

خلاصہ یہ کہ زبان ایک بہت بڑی نعمت ہے، اور پروردگار عالم کا ایک نہایت ہی لطیف ودقیق عطیہ ہے، یہ عضو (زبان) اگر چہ حجم وجسم کے اعتبار سے بہت چھوٹا ہے، لیکن اطاعت ومعصیت کے اعتبار سے بہت ہی سنگین وبڑا ہے، کفر یا ایمان کا اظہار زبان سے ہوا کرتا ہے اور یہی دونوں چیزیں بندگی وسرکشی کی معراج ہیں۔

زبان کی برائیوں سے وہی شخص نجات حاصل کرسکتا ہے، جو اس کو دین کی لگام سے اسیر کردے اور سوائے ان مقامات کے جہاں آخرت کا نفع ہو، کسی بھی جگہ آزاد نہ کرے۔

صفائی ستھرائی کو اپنا شعار بنائیے

حضرت ابن المسیب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ یُحِبُّ الطَّیِّبَ نَظِیفٌ یُحِبُّ النَّظَافَۃَ کَرِیمٌ یُحِبُّ الکَرَمَ جَوَادٌ یُحِبُّ الجُودَ فَنَظِّفُوْا اَفْنِیَتَکُمْ وَلَا تَشَبَّھُوْا بِالیَھُودِ.“

(رواہ الترمذی)

(اللہ تعالیٰ پاک ہے پاکی پسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نہایت ستھرا ہے ستھرائی کو پسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کرم کرنے والا ہے کرم کو پسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نہایت سخی اور عطا کرنے والا ہے، سخاوت وعطا کو پسند کرتا ہے۔لہٰذا تم صاف ستھرا رکھو اپنے صحنوں کو اور یہودیوں کی مشابہت اختیار نہ کرو (جو اپنے گھروں کے صحن وآنگن کو کوڑے وکرکٹ سے ناپاک وگندہ رکھتے ہیں۔)

دراصل اسلام معاشرتی طور پر انسان کو بلند اخلاق وکردار کا مالک بنانا چاہتا ہے، عزت نفس کا بھرپور خیال رکھتا ہے، ہر ایسے عمل کی تاکید کرتا ہے جو اسے معاشرے میں عزت عطا کرے اور ہر ایسے عمل سے منع کرتا ہے جو اسے قعر مذلت میں لے جا گرائیں۔ جسم ولباس کی پاکی صفائی ان اعمال میں سے ہے جو انسان کی فطرت اور جبلت کی چغلی کرتے ہیں، مناسب اور پاک وصاف لباس جہاں اچھے واعلیٰ کردار کی غمازی کرتے ہیں، وہیں گندہ جسم، بکھرے بال اور بدبودار لباس کج فطرتی کی طرف اشارہ کرے ہیں۔اس لیے انسان کو چاہیے کہ تکلف اور تصنع سے احتراز کرتے ہوئے میسر لباسوں میں سے مناسب لباس پہنے، جسم کی صفائی وستھرائی کا بھرپور خیال رکھے اپنے بستر، گھر، محلے اور گلی کو بھی صاف ستھرا رکھے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے

کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پراگندہ بال شخص کو دیکھا جس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَا كَانَ يَجِدُ هٰذا مَا يَسْكُنُ بِهٖ رَاسَهٗ" (رواه احمد)

(کیا اس شخص کو کوئی ایسی چیز (یعنی کنگھی وغیرہ) میسر نہیں ہے جس کے ذریعہ یہ اپنے بالوں کو درست کر سکے)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے بدن پر میلے کچیلے کپڑے تھے تو فرمایا:

"مَا كَانَ يَجِدُ هٰذا مَا يَغْسِلُ بِهٖ ثَوبَهٗ" (رواه احمد)

(کیا اس شخص کو وہ چیز (یعنی صابون یا پانی وغیرہ) میسر نہیں ہے جس سے یہ اپنے کپڑوں کو دھوڈالے۔)

معلوم ہوا کہ جسم کی درستگی ونفاست اور لباس کی صفائی وستھرائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک پسندیدہ تھی اور اس کا برعکس ناپسندیدہ ومکروہ، کیوں یہ چیزیں تہذیب وشائستگی کی علامت بھی ہیں اور اسلام کی روح اور پاکیزگی کے عین مطابق۔

ہاں عورتوں کی طرح بننا، سنورنا، تصنع اور بناوٹ اختیار کرنا ناپسندیدہ ہے، اسلام سادگی کی تعلیم دیتا ہے اور تکلف وتصنع سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہی مفہوم ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا:

"من ترک لبس ثوب جمال وھو یقدر علیه کساه الله حلّةَ الکرامة"

(یعنی جو شخص زیب وزینت کے لباس کو پہننا چھوڑ دے، باوجودے کہ وہ اس کے پہننے کی استطاعت وحیثیت رکھتا ہو۔ اس کو اللہ تعالیٰ عزت وعظمت کا جوڑا پہنائے گا۔)

کہ اس کا مقصود گندے بنے رہنا اور نہانے دھلنے سے دور رہنا نہیں ہے، بلکہ تکلف اور بناوٹ سے احتراز کرنا ہے۔

اسلام فقط جسم ولباس ہی کی صفائی وستھرائی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ ہر چیز میں سلیقہ

مندی، تہذیب وشائستگی کو پسند کرتا ہے، وہ گھر اور صحن کی صفائی وستھرائی کی بھی تلقین کرتا ہے، جیسا کہ حضرت ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ بالا اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فرمان میں گھر، گھر کے صحن اور آنگن وغیرہ کو صاف رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور صفائی ستھرائی نہ رکھنے پر تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ یہود کی مشابہت سے بچو، اس لیے کہ وہ اپنے گھر اور صحن وغیرہ کو صاف نہیں رکھتے۔

اتحاد واتفاق کا مظاہرہ کیجئے

مسلمانوں کو حاصل عزت، وقار اور قوت کو جس چیز نے تباہ کیا اور قعر مذلت میں لے جا گرایا، اس میں سب سے اہم چیز ان کا آپسی اتحاد واتفاق کا ختم ہوجانا، تعصب، برادری واد، مفاد پرستی کا آجانا اور قومی حمیت وغیرت کا رخصت ہوجانا ہے۔ جب کہ اسلام کا یہ واضح پیغام ہے کہ تمام مسلمان آپس میں ایک جسم کی طرح ہیں کہ جس طرح جب جسم کا کوئی ایک عضو دکھتا ہے تو سارا جسم اس دکھ سے متاثر ہوتا ہے اور محض ایک عضو میں تکلیف ہونے سے پورا جسم تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔

اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ کلمۂ توحید کی بنیاد پر ایک تن بن جائیں اور پوری ملت اسلامیہ ایک جسم کے مانند ہوجائے کہ اگر کسی ایک بھی مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچے یا وہ کسی آفت میں ومصیبت میں گرفتار ہو تو سارے مسلمان اس کے دکھ ورنج میں شریک ہوں اور سب مل کر اس کی تکلیف کو دور کرنے کی تدبیر کریں۔

ہمارے نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے، آپ کا ارشاد پاک ہے:

”تَرَىٰ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتُعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكٰى عُضْوًا تَدَاعَىٰ لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهْرِ وَالْحُمّٰى“.

(متفق علیه)

(اے مخاطب) تو مومنوں کو آپس میں ایک دوسرے سے رحم کا معاملہ کرنے، ایک دوسرے سے محبت وتعلق رکھنے اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی ومعاونت کا سلوک کرنے میں ایسا پائے گا، جیسا کہ بدن کا حال ہے کہ جب بدن کا کوئی عضو دکھتا ہے تو بدن کے باقی اعضاء اس ایک عضو کی وجہ سے ایک دوسرے کو پکارتے ہیں اور بیداری وبخاری

کے تعب و درد میں سارا جسم شریک رہتا ہے۔)

اگر مسلمان تفرقہ بازی کا شکار ہو جائیں اور رنگ و نسل، زبان وکلچر اور ذات پات کے دائروں میں سمٹ جائیں، تو ان کے ملی وجود اور ان کی اجتماعی طاقت کو انتشار واضمحلال کا گھن لگ جائے گا، اور جب ان کی اجتماعی حیثیت مجروح ہو کر غیر موثر ہو گی تو ان کا شخصی وانفرادی وجود بھی نہ صرف بے معنی ہو جائے گا، بلکہ ہر شخص مختلف آفات ومصائب کا شکار ہو گا۔

اس لیے چاہئے کہ ہر مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی سے اس طرح ربط وتعلق رکھے جس طرح دو حقیقی بھائی ہوتے ہیں، کہ آپس میں سلام ودعا کرتے ہیں، باہمی میل جول اور ملاقات کرتے ہیں، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، باہمی معاملات وتعلقات کو محبت وموانست اور رحم دلی کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں، ہدایا وتحائف کا تبادلہ کرتے ہیں، ایک دوسرے کی مدد واعانت کرتے رہتے ہیں اور ہر ایک دوسرے کے حالات کی رعایت اور اس کے طور طریقوں کی پاسداری کرتا ہے۔

اہل ایمان جہاں بھی ہوں، جس رنگ ونسل سے بھی تعلق رکھتے ہوں اور ان کی زبان ومعاشرت میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، لیکن انسان اور مومن ہونے کی حیثیت سے وہ ایک ہیں اور ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے درمیان کوئی انسانی امتیاز اور اونچ نیچ نہیں ہے، کوئی بھید بھاؤ نہیں ہے اور کسی طرح کی برتری وکمتری نہیں ہے، وہ جس عقیدہ کے حامل اور جس نظریۂ حیات کو ماننے والے ہیں اس کی روشنی میں اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ تمام انسان ایک باپ کی اولاد ہیں، تمام مسلمان ایک زنجیر کی کڑیاں ہیں، اگر وہ کڑیاں الگ الگ ہو جائیں تو زنجیر ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے۔

❋ ❋ ❋

حسب ونسب کوئی قابل فخر چیز نہیں

پوری انسانی مخلوق ایک کنبہ ہے، سب ایک ہی باپ ماں حضرت آدم وحوا علیہما السلام کی اولاد ہیں، اللہ تعالی نے انسانوں کو روئے زمین پر مختلف علاقوں میں پھیلا دیا ہے، کسی کا رنگ گورا ہے کسی کا کالا، کوئی لمبا ہے کوئی کوتاہ قامت، کسی کو زیادہ عقل ملتی ہے کسی کو کم، کوئی جسمانی اعتبار سے طاقت ور ہوتا ہے کوئی کمزور، پھر انسانی مزاجوں اور خیالوں میں الگ الگ رنگ پایا جاتا ہے، یہی بوقلمونی گلشن آدم کو رنگا رنگ بناتی ہے، ایک چمن میں اگر ایک ہی قسم کے پھول ہوں تو وہ کیسا بے رنگ و بے رونق معلوم ہوگا۔ چمن کی ساری خوب صورتی ہی اس سے ہے کہ اس میں قدم قدم پر قسم قسم کے پھول اپنے جدا جدا رنگوں کی بہار دکھلاتے ہیں۔

اب اگر کوئی گلشن کو ایک ہی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتا ہے تو گویا وہ خدا کی قدرت کو چیلنج کرتا ہے اور چمن کی دشمنی کر کے اسے تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح نسل انسانی میں ہر طرح کے تعصّبات کارخانۂ قدرت کو چیلنج کرتے ہیں اور بنی آدم کی دشمنی پر مبنی ہیں۔

اس لیے اسلام ہر قسم کے نسلی، خاندانی، لسانی، علاقائی اور قومی تعصب کو جاہلانا قرار دے کر ہر ہر قدم پر ان کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور بار بار اعلان کرتا ہے:

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ“ (حجرات)

(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت (یعنی آدم وحوا) سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا، تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا اشریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔ اللہ خوب جاننے

والا پورا باخبر ہے۔)

قرآن کریم کی اس آیت نے انتہائی حکیمانہ انداز میں نسب اور خاندان کی بنا پر فخر و غرور کے خبط کو کالعدم قرار دیا اور بتلا دیا کہ اس پر فخر درحقیقت کوئی تفاخر کی چیز نہیں، کیوں کہ تم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہو، کسی کو کسی پر نسبی برتری حاصل نہیں، نسبی اور قومی تفاخر بے بنیاد ہے اور باہمی منافرت وعداوت کا پیش خیمہ ہے۔ اصل مدارِ شرافت تقویٰ اور اتباعِ شریعت وسنت ہے۔

تفاخر بالانساب کی برائی بیان کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھے حکم دیا ہے کہ عاجزی اور فروتنی اختیار کرو، یہاں تک کہ کوئی شخص کسی پر فخر نہ کرے اور نہ کوئی شخص کسی پر ظلم کرے۔'' (مسلم شریف)

حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''نسب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے سبب تم کسی کو برا کہو اور عار دلاؤ، تم سب کے سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو، جس طرح ایک صاع دوسرے صاع کے برابر ہوتا ہے کہ جس کو تم نے بھرا نہ ہو، کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں ہے، علاوہ دین اور تقویٰ کے۔ آدمی کی برائی کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ زبان درازی، فحش گوئی اور بخل کرنے والا ہو۔ (مسند احمد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لوگ اپنے (ان) آباء واجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو مر چکے ہیں اور جن کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ دوزخ کا کوئلہ بن گئے ہیں۔ (مراد اس سے وہ لوگ ہیں، جن کا انتقال حالت کفر پر ہوا اور نعمت اسلام سے وہ محروم رہے) ورنہ (اگر فخر کرنے سے باز نہ آئے تو) وہ خدا کے نزدیک گوہ (غلاظت) کے کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل وخوار ہوں گے۔ جو غلاظت کو اپنی ناک سے ہٹاتا ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے جاہلیت کی نخوت کو اور آباء واجداد پر فخر کرنے کی عادت کو

دور کر دیا ہے۔ (یاد رکھو) آدمی (اب) یا مومن متقی ہے یا فاجر و بدکار، تمام انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام کی پیدائش مٹی سے ہوئی۔

اس حدیث میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے باپ دادا کے متعلق فخر وغرور کو غلاظت کے کیڑے سے تشبیہ دی ہے اور فرمایا آدمی دو قسم پر ہیں: مومن و متقی یعنی جو ایمان و تقویٰ اور اعمال صالحہ کی دولت سے مالا مال ہے تو وہ خود قابل تکریم ہے، اس کو کیا ضرورت اپنے آباء پر فخر کرے۔ دوسری قسم فاجر و بدکار کی ہے یعنی اگر فاجر ہے تو وہ خدا کے نزدیک ذلیل وخوار ہے، اس صورت میں اس کو کیا حق ہے کہ وہ تکبر و گھمنڈ کرے۔

علامہ ابن جوزیؒ فخر بالانساب کو شیطان کا مکر شمار فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''عوام کے لیے یہ بھی شیطان کا ایک دھوکا ہے کہ کسی کا کوئی نسب ہوتا ہے تو اپنے نسب پر مغرور ہو جاتا ہے، ایک کہتا ہے میں ابوبکرؓ کی اولاد ہوں، دوسرا کہتا ہے میں اولادِ علیؓ ہوں، تیسرا کہتا ہے میرا نسب فلاں عالم یا فلاں زاہد سے ملتا ہے، یہ لوگ اپنے اس معاملہ کی بنیاد دو باتوں پر رکھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو شخص کسی آدمی سے محبت رکھے گا، اس کی اولاد اور اس کے گھر والوں کو بھی چاہے گا، دوسرے یہ کہ بزرگوں کے لیے شفاعت ہے اور ان کی شفاعت کی زیادہ حق دار ان کی اولاد ہے، حالاں کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ رہی محبت سو اللہ تعالیٰ کی محبت ایسی نہیں جیسی آدمیوں کی محبت ہے۔ وہ تو اس شخص ہی سے محبت رکھتا ہے جو اس کی اطاعت کرتا ہے۔ اہل کتاب بھی تو یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں، ان کو اپنے باپ دادا سے کچھ نفع نہیں۔ اور اگر باپ کی محبت اثر کرتی ہے تو بغض بھی ضرور اثر کرتا ہے۔ باقی رہی شفاعت، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ولا یشفعون إلا لمن ارتضیٰ''

(یعنی شفاعت اسی کی کریں گے جن کے لیے اللہ تعالیٰ راضی ہوگا۔)

نوح علیہ السلام نے جب اپنے بیٹے کو کشتی میں بٹھانا چاہا تو ارشاد ہوا ''إنه ليس من أهلك'' یعنی اے نوح! یہ تمھارا لڑکا تمھارے اہل میں سے نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ

السلام کی شفاعت اپنے باپ کے حق میں اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اپنے چچا کے حق میں مقبول نہ ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا تھا کہ خدا کے یہاں میں تمھارے کچھ کام نہ آؤں گا۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے باپ کی نجات سے اس کی بھی نجات ہو جائے گی، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی یوں سمجھ بیٹھے کہ اس کے باپ کے کھانے سے اس کا بھی پیٹ بھر جائے گا۔ (تلبیس ابلیس)

صاحب روح المعانی علامہ سید محمود آلوسیؒ ایک خراسانی بزرگ کا واقعہ تحریر فرماتے ہیں کہ خراسان میں ایک سید زادہ شریف النسب تھے، لیکن جدی اخلاق اور اعمال کے متاع گراں مایہ کو لہو ولعب کی نذر کر چکے تھے۔ طرح طرح کے فسق و فجور میں گھرے ہوئے تھے، اس جگہ ایک حبشی عالم متقی تشریف فرما تھے، جو نسب کے اعتبار سے بھی آزاد کردہ غلام ہونے کی حیثیت رکھتے تھے۔ لوگ ان کی انتہائی تعظیم و توقیر کرتے تھے، ایک روز اتفاقاً یہ بزرگ مسجد کی طرف جا رہے تھے، خلق اللہ کی ایک بہت بڑی جماعت پیچھے تھی، یہ سید زادہ اچانک سامنے آ گئے۔ نشے میں دھت تھے، لوگوں نے ان کو بزرگ صاحب کے راستے سے ہٹانا چاہا، مگر یہ نہ ہٹے اور مجمع کو چیرتے ہوئے شیخ کے پاس پہنچے، ان کا دامن پکڑ لیا اور نہایت سخت اور متکبرانہ لہجے میں خطاب کیا:

''اے سیاہ ہونٹ اور سیاہ آواز والے کافر بن کافر! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا ہوں، مجھے ذلیل کیا جاتا ہے اور تیری عزت کی جاتی ہے، مجھے دھکے دیے جاتے ہیں اور تیری ہر قسم کی مدد کی جاتی ہے۔''

لوگوں نے یہ کلمات سنے تو سید زادہ کو مارنے کے لیے دوڑے۔ شیخ نے بمشکل بچایا اور کہا کہ میں ان کی یہ سب باتیں ان کے جد امجد صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر برداشت کرتا اور معاف کرتا ہوں۔ اس کے بعد ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ میں نے اپنے باطن کو سفید کر لیا اور تم نے اپنے باطن کو سیاہ کر ڈالا۔ اس لیے میرے دل کی سفیدی میرے سیاہ چہرے پر دیکھی گئی اور لوگوں کو بھلی معلوم ہوئی اور تمھارے دل کی سیاہی تمھارے سفید

چہرے پر دیکھی گئی جو لوگوں کی نفرت کا سبب بنی۔ میں نے تمھارے والد کی صفت اختیار کر لی تو لوگوں نے مجھے تمھارے والد کی صفت وحالت میں دیکھا اور تمھیں میرے والد کی صفت میں۔ اس لیے انھوں نے مجھے تمھارے والد کا بیٹا سمجھا اور تم کو میرے والد کا اور تمہارے ساتھ وہ معاملہ کیا جو میرے والد کے ساتھ کرنا تھا۔(اسلام اور نسبی امتیازات)

امت کے آپسی انتشار واختلاف کے اسباب پر اگر غور وفکر کیا جائے تو اس کا سرچشمہ نسلی تفاخر، خاندانی فرق وامتیاز اور قومی وعلاقائی بھید بھاؤ نیز ذات برادری کے تعصّبات ہی ملیں گے، جو انسانوں کو ان کے باعزت انسانی مرتبے سے گرا کر بے عقل جانوروں اور وحشی درندوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کو مربوط و مستحکم کرنے کے لیے کہ ضروری ہے کہ ہم ہر طرح کے قومی، نسلی، لسانی تعصّبات اور علاقائی و خاندانی تنگیوں سے ہٹ کر اسلامی اخوت ومحبت اور انسانی قدرومنزلت کے قیمتی اوصاف سے متصف ہوں، اور اخوت کا بیان ومحبت کی زبان کا عملی نمونہ بنیں۔

❁ ❁ ❁

حلال و پاکیزہ چیزیں کھایئے

طبیعت کی پاکیزگی اور احوال و اخلاق کی درستگی کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ ہم کھائیں وہ حلال و پاکیزہ ہو، اس کے بغیر اچھی صفات کا پیدا ہونا اور بری عادتوں کا چھوٹنا مشکل ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں طیب اور پاکیزہ غذا کو بنیادی حیثیت ہے، جیسا کہ معلم انسانیت نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

''اِنَّ اللّٰہ تعالٰی طَیِّبٌ لَایَقْبَلُ اِلَّا طَیِّباً، وَاِنَّ اللّٰہ تعالٰی اَمَرَ المُؤمِنِیْنَ بِمَا اَمَرَ بِهٖ المُرْسَلِینَ، فَقَالَ تعالٰی، ''یٰاَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمِلُوْا صَالِحاً... الایة'' وَقَالَ تعالٰی ''یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا کُلُوا مِنْ طَیِّبَاتِ مَارَزَقْنٰکُمْ وَشْکُرُوا اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُونَ'' ثُمَّ ذَکَرَ الرجلَ یُطِیْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ یَمُدُّ یَدَیْهِ اِلٰی السَّمَاءِ یَارَبِّ یَارَبِّ وَمَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهٗ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَغُذِیَ بِالحَرَامِ فانّٰی یُستَجَابُ لِذَالِکَ''(رواہ مسلم)

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ پاک ہے نہیں قبول کرتا مگر پاک چیز، اور بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس کا حکم کیا جس کا حکم رسولوں کو کیا، چنانچہ اس کا ارشاد ہے: ''اے رسولو! کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے اور عمل کرو نیک'' اسی طرح فرمایا: ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرو، اگر تم (واقعی) اسی کی بندگی کرتے ہو۔''

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو لمبا سفر طے کرتا ہے، پراگندہ بال اور خاک آلودہ حالت میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتا ہے ''اے

میرے رب! اے میرے رب! (دعا کرتا ہے) حالانکہ اس کا کھانا حرام کا، پینا حرام کا، پوشاک حرام کی، اور اسے غذا حرام کی ملی، تو پھر اس کے لئے استجابت (اور قبولیت) کہاں سے آئے؟۔)

اس حدیث پاک میں واضح طور پر حلال و پاکیزہ چیزوں کے کھانے کا حکم دیا گیا ہے اور حرام و ناپاک چیزوں سے کلی طور پر اجتناب کا حکم دیا گیا ہے۔ چناں چہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انتہائی طیب و پاک ذات ہے کیوں کہ وہ ہر طیب اور پاکیزہ کی خالق ہے، لہٰذا اس کے یہاں صرف وہی چیز قابل قبول ہو سکے گی جو طیب اور پاکیزہ ہوگی، کوئی غیر طیب اور خبیث چیز اس کے یہاں قبول ہونے کی نہیں، دل و دماغ، زبان و بیان اور اعضاء و جوارح سے تعلق رکھنے والی صرف وہی چیز اس کے یہاں قبولیت اور باریابی کا شرف پا سکے گی جو خالص طیب ہوگی۔

دل میں موجود وہی عقیدہ اس کے یہاں قبول ہوگا جو کفر و شرک اور غل و غش کی ہر آمیزش سے پاک و صاف ہوگا، زبان و بیان کی وہی پونجی وہاں شرف باریابی حاصل کر سکے گی، جو ذکر خالص اور قول طیب کے قبیل سے ہوگی، اعضاء و جوارح سے صادر ہونے والے صرف وہی اعمال و افعال اس کے یہاں مقبول ہوں گے جو بدعت اور مخالفت سنت کی ہر میل سے پاک ہوں گے اور صدقہ و خیرات کے لیے اسی دولت کے قبول ہونے کی امید کی جا سکتی ہے جو حلال محض اور پاکیزہ و ستھری ہوگی۔

لہٰذا مومن کو چاہئے کہ وہ محفوظ رکھے اپنے دل کو برے اعتقاد سے، اپنی زبان کو بری باتوں سے، اپنے اعضاء جوارح کو برے اعمال سے اور اپنے صدقے و خیرات کو حرام کی آمیزش سے، یعنی شرک و کفر، ریاء و نمود، احداث و بدعت اور حرمت و اشتباہ کی ہر میل اور کھوٹ سے بچ کر رہے اور ہر اعتبار سے طیب و خالص و ستھرا و پاکیزہ بن کر اس کی بارگاہ قدس میں حاضر ہو تب قبولیت و عنایت سے مشرف ہو سکے گا۔

یوں تو اسلامی تعلیمات کی رو سے ہر چیز اور ہر شئ میں طیب اور پاکیزہ ہونے کی

شرط بنیادی حیثیت کی حامل ہے،لیکن خاص کر حلال کھانے کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے کیوں کہ غذا کا اثر جسم وطبائع پر پڑتا ہے،اگر پاک وصاف اور حلال وطیب غذا ہوگئ تو روح کو تازگی ،قلب کو سرور حاصل ہوگا،اور اعمال حسنہ کی طرف دل مائل ہوگا،جبکہ ناپاک،گندی اور حرام غذا انسان کو انسانیت سے نکال کر حیوانیت میں داخل کر دیتی ہے،اس کے مزاج کو آلودہ اور طبیعت کو خبیث بنا دیتی ہے۔

امام طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

”یاایھا الناس کلوا مما فی الارض حلالا طیباً“

(اے لوگو کھاؤ ان چیزوں سے جو زمین میں ہیں حلال اور پاک)

تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے یعنی میں جو دعا مانگوں وہ قبول ہو جایا کرے،اس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”یا سعد اطب مطعمک تکن مستجاب الدعوۃ والذی نفس محمد بیدہ ان العبد لیقذف اللقمۃ الحرام فی جوفہ، مایتقبل اللہ منہ عملاً اربعین یوما، وایما عبد نبت لحمہ من سحت فالنار اولی بہ“

(اے سعد! اپنی خوراک حلال رکھو مستجاب الدعوات ہو جاؤ گے،قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے،آدمی لقمہ حرام پیٹ میں ڈالتا ہے تو چالیس دن تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا،اور جس آدمی کا گوشت حرام سے بنا ہو پس (جہنم کی) آگ اس کے لیے زیادہ سزوار ہے۔

غریبوں اور مسکینوں کی خبر گیری کیجئے

یہ دنیا امتحان گاہ ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار نعمتیں عطا کر کے آزمائش میں ڈال دیا ہے، ان نعمتوں میں انسان کو سخت آزمائش میں ڈالنے والی نعمت مال و دولت کی کثرت ہے، اس سے انسان کے فسق و فجور میں ملوث ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں، مگر جو لوگ یتیموں، مسکینوں، غرباء اور حاجت مندوں پر صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں ایسے نیک بندوں کو اللہ اس شر و فساد سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس لیے عام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ غریبوں اور مسکینوں کی خبر گیری رکھیں اور ان کے حقوق کی تکمیل کریں۔

مسکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہوتے ہیں، سماج میں غریب، مسکین، مفلس، محتاج اور ضرورت مند لوگوں کی ہر طرح مدد نیک سلوک، ان کے حقوق کی حفاظت، لوگوں کی ذمہ داری ہے، یہ احسان نہیں بلکہ حق کی ادائیگی ہے۔

قرآن حکیم اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مسکین، حاجت مند اور مفلس کے ساتھ اچھے سلوک کی بڑی تاکید فرمائی گئی ہے، اور ان سے غفلت کے بدترین نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے، مثلاً جب جہنمیوں سے پوچھا جائے گا کہ تم کو کس جرم کی پاداش میں یہاں لایا گیا ہے تو ان کا جواب یہ ہوگا:

''ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے''۔

نیک اور خدا ترس، غریب اور مسکین جو مالی اور جسمانی اعتبار سے کمزور ہونے کی بناء پر عام لوگوں کی نگاہ میں حقیر ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک وقیع اور مقرب ہوتے ہیں، محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور خوشنودی کمزوروں اور غریبوں کے ساتھ نیک سلوک، ان کی دلجوئی، ان کے حقوق کی حفاظت کا شیوہ اختیار کر کے حاصل کی جاسکتی ہے، یہ بڑے بابرکت لوگ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی دعا اور برکت سے ان کے محسنوں کو اپنے فضل وکرم سے نوازتا ہے، انہیں کشادہ رزق عطا کرتا ہے اوران کی مدد بھی فرماتا ہے۔

صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے مسکینوں، بیواؤں اور بیکس عورتوں کی ضرورت کی خاطر سرگرم عمل رہنے والے کے لیے اللہ کی طرف سے اجر وانعام کی بشارت ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"الساعي على الأرملة والمسكين كالمجاهد في سبيل الله".

"بیوہ اور مسکینوں کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے"۔

پڑوسیوں کیساتھ اچھا برتاؤ کیجئے

ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علاحدہ اور بجائے خود مستقل ہے، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہوا ہو اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو، تقاضائے معاشرت کے انہیں حقائق کا بھرپور احترام کرتے ہوئے تمام مذاہب نے ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہوں، آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے، اس لیے کہ وقت ضرورت وہی اوروں سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

معاشرتی زندگی کے مسائل میں یہ نکتہ بھی کافی اہم ہے کہ انسان کو اسی سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے، جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں اس لیے ان کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے، تاکہ پڑوس میں دوزخ کی شعلہ فشانیوں کی جگہ جنت کی تازہ، خوشگوار اور معطر فردوسیت کا ماحول رہے، اور ایک دوسرے کی محبت، تعاون اور مدد پر بھروسہ قائم رہے۔

اسلام نے تمام ہی مخلوق خدا خصوصا انسانوں کے ساتھ نیک برتاؤ اور حسن معاملہ کی بہت تاکید کی ہے لیکن اس معاملے میں پڑوسی کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے، زنا کسی کے ساتھ بھی حرام ہے لیکن پڑوسی کی بیوی کے ساتھ اس کی قباحت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، بداخلاقی، لڑائی جھگڑا کسی کے ساتھ بھی غلط ہے لیکن یہی معاملہ پڑوسی کے ساتھ اور زیادہ غلط ہے، کسی بھوکے کو کھانا کھلانا باعث ثواب، لیکن بھوکے پڑوسی کو کھلانا اور زیادہ ثواب کا باعث، یہاں تک کہ اگر آپ اپنی زمین بیچ رہے ہیں تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ پہلے پڑوسی کو خبر کریں اور اگر وہ مطلوبہ قیمت میں خریدنے کے لیے تیار ہو تو اسی کے ہاتھ

فروخت کرنا ضروری۔

الغرض پڑوسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، اس کی عزت و تعظیم کرنا، اس کی دیکھ ریکھ رکھنا بھی اسلامی تعلیمات کا ایک حصہ ہے، کسی مسلمان کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اپنے پڑوسی کے حقوق کو نظر انداز کرے۔ ملاحظہ ہو اس حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات:

”مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَومِ الآخِرِ، فَلْيُكْرِمْ جَارَهُ“

(جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ:

”ایّ الذنب اعظم؟قال ان تجعل لله ندّاً وهو خلقک قیل ثم ایّ؟قال ان تقتل ولدک مخافة ان یطعم معک قیل ثم ایّ؟قال ان تزانی حلیلة جارک.“

(کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا کہ تو اللہ کا کسی کو شریک ٹھہرائے، حالانکہ اسی نے تجھے پیدا کیا ہے۔عرض کیا گیا پھر کون سا؟ فرمایا کہ تو اپنی اولاد کو قتل کرے، اس خوف سے کہ وہ تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائیں گے۔عرض کیا گیا پھر کون سا؟ ارشاد ہوا کہ تو اپنے پڑوسی کی عورت سے زنا کرے۔)

واضح رہے کہ پڑوسیوں میں سب سے زیادہ حسن سلوک کا حقدار وہ شخص ہے جس کا گھر سب سے قریب ہو، پھر اس کے بعد درجہ بدرجہ۔

صحیح بخاریؒ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

”یارسول الله انّ لی جارین فالٰی ایّهما اهدی؟فقال الٰی اقربهما منک باباً.“

(اے اللہ کے رسول! میرے دو پڑوسی ہیں تو میں ان میں سے کس کو ہدیہ بھیجوں؟

فرمایا: اس کی طرف جس کا دروازہ تمہارے زیادہ نزدیک ہو۔)

پڑوسی کے حقوق کے ضمن میں صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ اسے تکلیف نہ دی جائے بس، بلکہ حسنِ جوار کا اصل تقاضا اور صحیح معیار یہ ہے کہ پڑوسی کی تکلیف وایذاء کو برداشت کیا جائے، جیسا کہ مسند احمد میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

"ان اللہ یحب الرجل یکون له الجار یؤذیه جواره فیصبر علی اذاه حتی یفرق بینهما الموت او ظعن."

(بے شک اللہ تعالیٰ اس آدمی کو پسند کرتا ہے جس کا پڑوسی اسے تکلیف دے، مگر وہ اس پر صبر کرے یہاں تک کہ موت ان دونوں کے درمیان جدائی کردے یا وہ کوچ کر جائے۔)

اسلام نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کی ہمسائیگی کو تسلیم کیا ہے جس کو عام طور پر پڑوسی اور ہمسایہ نہیں کہتے مگر وہ ہمسایہ کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے، جیسے ایک سفر کے چند رفیق، ایک مدرسہ کے چند طالب علم، ایک کارخانہ کے تمام ملازم اور ایک تجارت میں شریک تمام لوگ، یہ بھی حقیقت میں ایک طرح کی ہمسائیگی ہی ہے اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور محبت ہے۔

اسلام نے ہمسائیگی کے مراتب، سماجی قدروں کے اعتبار سے متعین کیا ہے، ہمسایوں میں تقدم اس کو حاصل ہے، جس کو ہمسایہ ہونے کے ساتھ ساتھ قرابت یا ہم مذہب یا کوئی اور گہرا تعلق ہو۔

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے۔ اس ہدیہ اور تحفہ کے لیے کسی بیش قیمت چیز کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لیے کافی ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

''اے ابوذر! جب شوربہ پکاؤ تو پانی بڑھادو اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہو''۔

مسلمانوں کی شرافت اور ہمسائیگی کی اخلاقی ذمہ داریوں کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود تو شکم سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے''۔

برائی برائی ہے جہاں بھی ہو، اور گناہ گناہ ہے، جس سے بھی سرزد ہو، لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہاں لازمی طور سے نیکی ہی متوقع ہو تو اس گناہ اور برائی کا درجہ عام گناہوں اور برائیوں سے بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے، پڑوس کے مکان میں چوری ہو یا بدکاری، بدنظری ہو یا بدکلامی یہ اخلاقی خیانت انتہائی شرمناک ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تکمیلی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوسی سے اسی طرح محبت رکھنے کا حکم دیا ہے جو انسان خود اپنی جان سے رکھتا ہے بلکہ جو نہ کرے اس کی سب سے بڑی دولت، دولت ایمان کے چھن جانے کا خطرہ بھی ظاہر فرمایا ہے، ارشاد ہے:

''تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوگا جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لیے وہی پیار نہ رکھے جو خود اپنی جان کے لیے پیار رکھتا ہے''۔

اسلام نے ہمسایوں میں دوست ودشمن اور مسلم اور غیر مسلموں کی تمیز نہیں کی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انہوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا، کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا؟ کیوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ مجھے جبرئیل علیہ السلام ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ کہیں وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار نہ بنادیں۔

بچوں کو پیار کیجئے

آج کے بچے ہی مستقبل کا معاشرہ ہیں، ان کی جیسی تربیت اور ان کے ساتھ جیسا برتاؤ کیا جائے گا، کل بڑے ہو کر ویسا ہی معاملہ وہ افراد معاشرہ کے ساتھ کریں گے، نیز نا سمجھ اور بے شعور ہونے کی وجہ سے کسی اور کے مقابلے میں وہ سب سے زیادہ حسن سلوک اور رحم کے مستحق ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ان کے ساتھ شفقت ومحبت کا معاملہ کیا جائے اور محبت ویگانگت کے ماحول میں ان کی تربیت کی جائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یہی تعلیم دی ہے نیز خود بھی آپ اسی پر عامل رہے ہیں، ملاحظہ ہو بچوں کے تعلق سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَاءَ اَعْـرَابِیٌّ الَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ اَتُقَبِّلُوْنَ الصِّبْیَانَ فَمَا نُقَبِّلُھُمْ . فَقَالَ النبیُ ﷺ اَوَ اَمْلِکُ لَکَ اَنْ فَزَعَ اللّٰہُ مِنْ قَلْبِکَ الرَّحْمَةَ. (متفق علیہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک دیہاتی حاضر ہوا (اور جب اس نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھا کہ وہ بچوں کو چومتے اور پیار کرتے ہیں) تو کہنے لگا کہ کیا تم لوگ بچوں کو چومتے ہو؟ ہم تو بچوں کو نہیں چومتے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس کی یہ بات سن کر) فرمایا: کیا میں اس بات پر قادر ہوسکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل میں سے جس رحم وشفقت کو نکال لیا ہے اس کو روک دوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل کو رحمت وشفقت اور پیار ومحبت سے خالی کر دیا ہے تو یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کہ

تمہارے دل میں رحمت وشفقت اور محبت کا جذبہ پیدا کروں، کہ تم بھی پیار ومحبت کرنے لگو، ورنہ اعلیٰ نفسی اور انسانیت یہی ہے کہ دل میں ہر ایک کے لیے خصوصا بچوں کے لیے جذبہ شفقت ومحبت ہونا چاہئے۔

حدیث کا مقصد بے رحمی و بے مروتی اور سخت دلی کے خلاف نفرت کا اظہار کرنا اور اس قسم کے لوگوں کو سختی کے ساتھ متنبہ کرنا ہے، نیز اس ارشادگرامی سے اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ دلوں میں رحم وشفقت کے جذبات کا ہونا اللہ تعالیٰ کا ایک بہترین عطیہ ہے اور اسی کا پیدا کیا ہوا ہے، اگر وہ کسی شخص کے دل سے رحم وشفقت اور محبت ومروت کے جذبات کو نکال دے تو پھر کسی کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اس شخص کے دل کو ان جذبات کی دولت عطا کر دے۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں میں نے کسی کو اپنے خاندان سے اس قدر محبت کرتے نہیں دیکھا جس قدر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت ابراھیم عوالی میں پرورش پاتے تھے، جو مدینہ سے تین چار میل کی مسافت پر ہے، انکے دیکھنے کے واسطے آپ مدینہ سے پیادہ پا جاتے، گھر میں دھواں ہوتا رہتا، گھر میں جا کر پھر بھی انّا کے ہاتھ سے لے لیتے اور منہ چومتے، پھر مدینہ کو واپس آتے۔

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے انتہاء محبت تھی آپ فرماتے تھے کہ یہ میرے گلدستے ہیں، حضرت فاطمہؓ کے گھر جاتے تو فرماتے، میرے بچوں کو لانا، وہ صاحبزادوں کو لاتیں آپ ان کے بوسے لیتے اور سینے سے لپٹا لیتے۔

ایک بار اقرع بن حابس جو عرب کے ایک رئیس شخص تھے، خدمت اقدس میں آئے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین کا منہ چوم رہے تھے، انہوں نے کہا میرے دس بچے ہیں میں نے کبھی کسی کا بوسہ نہیں لیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو اوروں پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔

حضرت ابوقتادہؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود تھے

کہ اچانک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نواسی امامہؓ کو کندھے پر چڑھائے ہوئے تشریف لائے اور اسی حالت میں نماز پڑھائی جب رکوع میں جاتے تو ان کو اتار دیتے پھر کھڑے ہوتے تو چڑھا لیتے، اسی طرح پوری نماز ادا فرمائی (بخاری:۱؍۷۴)

اپنے بیٹے حضرت ابراہیم کی وفات کے موقع پر آپ نے فرمایا تھا ''آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں دل غمزدہ ہو رہا ہے، لیکن زبان سے وہی باتیں کہیں گے جس کو اللہ پسند کرتا ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نواسی حالت نزع میں تھیں، صاحبزادی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو وہ نواسی حالت نزع میں ہی آپ کی آغوشِ مبارک میں رکھ دی گئی۔ آپ نے اس کی حالت دیکھی تو آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔ اس پر حضرت سعدؓ نے فرمایا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا یہ رحم ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔ (سیرت النبی)

جانوروں پر بھی رحم کیجئے

عَنْ عَبدِاللہ بْنِ عَمْرو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللہِ ﷺ اَلرَّاحِمُونَ یَرْحَمُھُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمُکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ۔

(رواہ ابو داؤد)

حضرت عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مخلوق خدا پر رحم وشفقت کرنے والوں پر رحمٰن کی رحمت نازل ہوتی ہے، لہٰذا تم زمین والوں پر رحم وشفقت کرو تا کہ تم پر وہ رحم کرے جو آسمان میں ہے۔

''زمین والوں پر'' اس میں سارے جاندار داخل ہیں خواہ وہ حیوان ہوں یا انسان اور انسان بھی خواہ نیک ہوں یا بد، نوکر ہوں یا غلام۔ ''جو آسمان میں ہے'' اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ جس کا کمال قدرت اور جس کی سلطنت آسمانوں میں بھی ہے وہ تم پر رحم کرے گا۔ یا پھر اس سے مراد ملائکہ ہیں، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تم زمین پر رہنے والوں پر رحم وشفقت کرو تا کہ آسمانوں میں رہنے والے یعنی ملائکہ کا رحم تم پر۔ اور تمہارے حق میں ان کا رحم یہ ہے کہ وہ تمہارے دشمنوں اور ایذاء پہنچانے والی مخلوقات جیسے جنات وشیاطین اور شریر انسانوں سے تمہاری حفاظت کریں اور بارگاہ ایزدی میں تمہارے لیے دعا واستغفار اور طلب رحمت کریں۔

ایک روایت میں ہے کہ:

''ایک مرتبہ حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو مار رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی ابو مسعود تم کو جس قدر اس غلام پر اختیار ہے اس سے زیادہ خدا کو تم پر اختیار ہے۔ ابو مسعودؓ نے پیچھے مڑ کر دیکھا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ ابو مسعود انصاریؓ

نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اس غلام کو رضاء الٰہی کی خاطر آزاد کر دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر ایسا نہ کرتے تو آتشِ دوزخ تم کو چھو لیتی۔''

ایک دوسری روایت بھی ملاحظہ ہو:

ایک شخص خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا عرض کیا یا رسول اللہ میں غلاموں کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں، آپ خاموش رہے اس نے پھر پوچھا آپ پھر خاموش رہے اس نے تیسری مرتبہ سوال کیا آپ نے فرمایا ہر روز ستر دفعہ معاف کرو۔

اسوۂ رسول اکرم میں ہے کہ:

ایک موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ذرؓ سے فرمایا یہ غلام تمہارے بھائی ہیں، خدا نے تم کو ان پر فضیلت دی ہے اگر وہ تمہارے مزاج کے موافق نہ ہوں تو ان کو فروخت کر ڈالو، خدا کی مخلوق کو ستایا نہ کرو، جو کھاؤ انہیں کھلاؤ جو تم پہنو انہیں پہناؤ، ان کو اتنا کام نہ دو جو وہ نہ کر سکیں اور اگر اتنا کام دو تو خود بھی ان کی اعانت کرو۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

ایک مرتبہ ایک اونٹ راہ میں آپ کی نظر سے گزرا جس کے پیٹ اور پیٹھ بھوک کی وجہ سے مل گئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان بے زبانوں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔

دوسرا واقعہ آپ نے یہ لکھا ہے کہ:

ایک بار ایک دراز گوش (گدھا) راستہ میں نظر آیا جس کا چہرہ داغا گیا تھا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اس کا چہرہ داغا ہے اس پر خدا کی لعنت ہے۔

یہ واقعہ بھی علامہ ہی کے قلم سے سنیں:

ایک دفعہ ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کے ہاتھ میں کسی پرندے کے بچے تھے اور وہ چیں چیں کر رہے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ بچے کیسے ہیں، صحابیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں ایک جھاڑی سے گذرا تو ان

بچوں کی آواز آرہی تھی، میں ان کو نکال لایا ان کی ماں نے دیکھا تو بیتاب ہو کر سر پر چکر کاٹنے لگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فوراً جاؤ اور ان بچوں کو وہیں رکھ آؤ جہاں سے لائے ہو۔

ان اقوال وواقعات سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہر ایک مخلوق خدا کے ساتھ رحم وکرم اور نرمی کا معاملہ کیا جائے، کسی بھی مخلوق کو ستانا اور اذیت دینا جائز نہیں ہے، خواہ وہ انسان ہو یا جانور، درندہ ہو یا پرندہ، ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک کرنا ضروری ہے۔

کسی پر ظلم نہ کیجئے

معاشرہ کے نظام کو پراگندہ اور کمزور کرنے میں جور وظلم کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے، ظالم وجابر طاقتیں نہ صرف یہ کہ معاشرے کی اجتماعیت کو تباہ وبرباد کردیتی ہیں، بلکہ اپنی طاقت وقوت بھی کھو بیٹھتی ہیں۔مظلوموں کے سینوں سے نکلنے والی آہ ان کے خرمن ہستی کو جلا کر خاک کردیتی ہے اور انھیں تباہی وبربادی کے دھانے پر لا کھڑا کردیتی ہے۔

افسوس! آج کل معاشرے میں ظلم وستم کو عروج ہو رہا ہے اور ظالم طاقتیں معصوموں کے مالوں کو ھڑپنا اور ان کی عزت وآبرو سے کھیلنا اپنا حق سمجھنے لگی ہیں، ظالم وستمگر اپنی طاقت بھر انسانی معاشرہ کے حقوق کو پامال کررہے ہیں، لوگوں کے بے پناہ منافع ثروت کو لوٹ رہے ہیں، اور قانون عدل وانصاف ایک بے جان مجسمہ بن کر رہ گیا ہے۔

قرآن مجید ان ظالموں کی ھلاکت وبربادی کا ان الفاظ میں اعلان کرتا ہے:

''وَتِلْكَ الْقُرَى أَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِم مَّوْعِداً''

(کہف)

(اور یہ بستیاں ہیں جب انہوں نے (یعنی ان کے بسنے والوں نے) ظلم کیا تو ہم نے ان کو ہلاک کردیا، اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے ایک وقت متعین کیا تھا۔)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

''وَمَن يَظْلِم مِّنكُمْ نُذِقْهُ عَذَاباً كَبِيراً'' (الفرقان)

(اور جو تم میں ظالم ہوگا ہم اس کو بڑا عذاب چکھائیں گے۔)

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''الظلم ظلمات یوم القیامۃ'' (ترمذی)

(ظلم قیامت کی تاریکیوں میں سے ایک تاریکی ہے۔)

اسلام کا سب سے بڑا مقصد ہر چیز میں عدالت قائم کرنا ہے، اس لیے وہ اپنے ماننے والوں کو ہر ایک کے ساتھ کسی چیز کا اعتبار کئے بغیر اور کسی شخصی عنوان کا لحاظ کئے بغیر عدالت ومساوات برتنے کا حکم دیتا ہے، حق کشی وستمگری کو ہر اعتبار سے ہر شخص کے ساتھ ممنوع قرار دیتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (مائدہ:۸)

(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے لیے پوری پابندی کرنے والے انصاف کی شہادت ادا کرنے والے رہو اور کسی خاص گروہ کی عداوت تم کو اس بات پر باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔)

اِترائیے نہ

آپ نے دیکھا ہوگا کہ پست ذھن رکھنے والے افراد کے بیچ پرورش پانے والے بہت سے افراد جب مال و دولت حاصل کر لیتے ہیں یا معاشرہ میں کسی اچھی پوسٹ پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ اترانے لگتے ہیں اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہوئے اپنی برتری کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ جہاں بھی جاتے ہیں ان کی ساری کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنی شرافت کا ڈھنڈورا پیٹیں۔

جو شخص واقعی عظیم ہوتا ہے، وہ اعلی ظرف ہوتا ہے، وہ اپنے اندر کبھی بھی اس قسم کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتا اور نہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اپنی برتری و بزرگی کی نمائش کرے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ خود نمائی کوئی سعادت نہیں، اور غرور و تکبر سے عزت حاصل نہیں کی جا سکتی۔

تکبر کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو صفات کمالیہ میں دوسروں سے برتر سمجھے۔ ظاہر ہے کہ جب انسان کا اپنے متعلق ایسا خیال ہوتا ہے، تو نفس پھول جاتا ہے اور پھر اس کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں، مثلاً راستہ میں چلتے وقت دوسروں سے آگے قدم رکھنا، مجلس میں صدر مقام پر بیٹھنے کی کوشش کرنا، دوسروں کو نظر حقارت سے دیکھنا، یا اگر کوئی سلام کرنے میں پیش قدمی نہ کرے تو اس پر غصہ ہونا، کوئی تعظیم نہ کرے تو ناراض ہونا، کوئی اگر نصیحت کرے تو ناک بھوں چڑھانا، حق بات معلوم ہونے کے بعد اس کو نہ ماننا۔ (نعوذ باللہ منہا)

اسلام جو ایک ایسے معاشرے کا وجود چاہتا ہے، جو ہر قسم کے نسلی، مالی اور علاقائی امتیازات سے پاک و صاف ہوں، بھلا ایسی فرعونیت کی وہ کب اجازت دے سکتا ہے۔

چنانچہ ایسے لوگوں کے تعلق سے قرآن وحدیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔ ملاحظہ ہو ارشاد باری:

''بِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ'' (زمر)

(تکبر کرنے والے کا بہت برا ٹھکانہ ہے۔)

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"من تواضع لله درجة يرفعه الله به درجة حتى يجعله الله في اعلى عليين ومن تكبر على الله درجة يضعه الله به درجة حتى يجعله في اسفل السافلين'' (الترغيب والترهيب)

(جس نے اللہ رب العزت کے لیے ایک درجہ انکساری کی اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اسے علیین میں اعلی مقام تک پہنچا دیتے ہیں اور جس نے اللہ تعالی پر ایک درجہ تکبر کیا تو اللہ تعالی اس کا مرتبہ گھٹاتا ہے یہاں تک کہ اسے جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں پہنچا دیتا ہے۔)

درحقیقت کبریائی حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص اور اسی کی شان کو زیبا ہے، پس انسان ضعیف البنیان جس کو دوسرے کا اختیار تو درکنار اپنے ہی نفس کا اختیار نہیں، اس صفت الٰہی میں ساجھی ہو، کس طرح جرأت کر سکتا ہے؟ اور چوں کہ متکبر شخص باوجود حقیر وکمترین کے، حق تعالیٰ کی مشارکت چاہتا اور اس صفت کمالیہ میں اس کے ساتھ منازعت کرتا ہے، اس لیے انتہائی درجے کا احمق اور خبیث النفس سمجھا جائے گا۔ نیز تکبر کے سبب حق بات کے انکار کی نوبت آتی ہے، جس سے دینی سعادت کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور متکبر اللہ کی مخلوق کو بہ نظر حقارت دیکھنے لگتا ہے اور یہ بات حق تعالیٰ کو بہت ناگوار ہے۔ اس لیے ایک مؤمن بلکہ ایک انسان کو اس خصلت سے دور رہنا چاہیے۔

❂ ❂ ❂

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے

دنیا آخرت کی کھیتی اور منزل کا پڑاؤ ہے اور انسان کی حیثیت ایک مسافر کی ہے جو اپنے جسم خاکی پر سوار ہو کر سفر آخرت طے کر رہا ہے، اس لیے چاہئے کہ اپنی سواری کا گھاس دانہ بقدر کفایت اٹھائے اور سفری ضرورتوں میں کام آنے والا سامان مہیا کر کے وہ بیج بوئے جس کو آخرت میں کاٹے، اور پھر دائمی زندگی آرام سے گزارے، اگر اپنی سواری ہی کی پرورش وفربہی میں مشغول ہو جائے گا تو قافلہ کوچ کر جائے گا اور یہ غافل منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے گے۔

دنیا کے تمام جھگڑوں، بکھیڑوں اور مخلوقات وموجودہ چیزوں کے ساتھ گہرا تعلق رکھنے کا نام حب دنیا ہے۔ علم ومعرفت الٰہی اور نیک کام جن کا ثمرہ مرنے کے بعد ملنے والا ہے ان کا وقوع اگر چہ دنیا ہی میں ہوتا ہے، مگر در حقیقت وہ دنیا سے مستثنیٰ ہیں اور ان کی محبت دنیا کی محبت نہیں ہے، بلکہ آخرت کی محبت ہے، حق تعالیٰ فرماتا ہے:

''إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً'' (کہف)

(ہم نے دنیا کی تمام چیزوں کو زمین کی زینت کا سامان بنایا ہے تا کہ لوگوں کو آزمائیں کہ کون بہتر عمل کرتا ہے۔)

انسان کو جاہ ومال کے علاوہ زمین کی بھی محبت ہوا کرتی ہے، مثلاً مکان بنائے یا کھیتی کرے، نباتات کی بھی محبت ہوتی ہے، مثلاً جڑی بوٹی ہو کہ اس کو دواؤں میں استعمال کرے، یا سبزی ودیگر پیداوار یا پھل پھول ہو کہ اس کو کھائے اور مزے اڑائے، معدنیات کی بھی محبت ہوتی ہے، مثلاً برتن اور اوزار بنائے، زیور پہنے یا نقد جمع کرے،

حیوانات کی بھی محبت ہوتی ہے، مثلاً شکار کرے اور کھائے یا ان پر سواری کرے اور اپنی زینت بڑھائے، آدمیوں کی بھی محبت ہوتی ہے مثلاً یہ کہ عورتوں کو منکوحہ اور خادمہ بنائے یا مردوں کو نوکر اور خدمت گار بنائے۔ انہیں چیزوں کی محبت کا نام ہوائے نفس اور حب دنیا ہے، جس کو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى، فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى'' (النازعات)

(جس نے اپنے نفس کو خواہش سے روک لیا اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔)

دنیا اور سامان دنیا انسان کے لیے ہے، اور انسان اللہ تعالی کی عبادت اور اس کے احکامات کی اطاعت کے لیے ہے، اس کی تخلیق کا مقصد یہی ہے، جو شخص اس مقصد کے مطابق زندگی گذارتا ہے اور اسباب دنیا کو بقدر ضرورت حاصل کرتا ہے، وہ درست راہ پر گامزن ہے، اس کے بالمقابل جس نے دنیا اور سامان دنیا ہی کو مقصود اصلی سمجھ لیا وہ راہ حق سے بھٹک گیا اور خطرہ ہے کہ کسی گھاٹی میں گر کر ہلاک نہ ہو جائے۔

اس لئے بلاشبہ اس کے لیے جائز ہے کہ بقدر ضرورت دنیا و اسباب دنیا سے نفع اٹھائے اور جائز طریقے سے لطف اندوز ہو، لیکن ان چیزوں میں ایسا مشغول ہو جانا کہ خدا اور سول کو بھول جائے اور آخرت کو فراموش کر بیٹھے قطعا جائز نہیں ہے۔

گناہوں سے بچنے کا نسخۂ کیمیا

انسانی ہاتھوں سے دنیا میں رونما ہونے والے شر وفساد اور ظلم و زیادتی کی تاریخ پر اگر ہم نظر ڈالیں تو وہ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ انسانی تاریخ۔ قابیل کے ہاتھوں سے شروع ہونے والا فساد نہ آج تک ختم ہوا اور نہ رہتی دنیا تک ختم ہوگا، مال و دولت میں ناجائز حد تک اضافہ کی حرص اور عیش پرستی و اقتدار کی ہوس نے اسے ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کرنے اور دوسروں کے حقوق کو سلب کرنے پر جری کر دیا ہے۔ دوسروں کو ذلیل و رسوا کرنا اس کا شیوہ، غیبت و چغل خوری اس کی عادت، موقعہ پاتے ہیں دوسروں کے مال کو ہضم کر لیتا ہے، اور طاقت ور ہوتے ہی گردن کاٹ لیتا ہے۔ اس موقع پر نہ وہ یہ سوچتا ہے کہ جس کا مال وہ لے رہا ہے اور جس کی گردن کاٹ رہا ہے وہ بھی اسی جیسا ایک ضرورت منداور ہمدردی و خیر خواہی کا طالب انسان ہے، اور نہ ہی یہ کہ اس کے خون سے رنگین ہونے والا ہاتھ درحقیقت اپنے بھائی ہی کے خون سے رنگین ہو رہا ہے۔

اشرف المخلوقات کہی جانے والی مخلوق کے ہاتھوں انجام پانے والی خونچکاں داستانِ الم کے اسباب و عوامل کیا ہیں، اور وہ انسانیت سے نکل کر حیوانیت و درندگی کا مظاہرہ کیوں کرنے لگتا ہے، اس پر اگر غور وفکر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل وجہ مال و دولت کی حرص اور طولِ عمر کی تمنا۔ ہر انسان مال و دولت اور جاہ وحشمت کے ساتھ ہمیشہ ہمیش دنیا میں رہنے کی تمنا و آرزو لیے رہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ دنیا کی ساری دولت وعظمت بلکہ ساری خدائی اسی کے دست قدرت میں رہے، اور وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اس کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے، اور ایک دن اسی مٹی کا ڈھیر بن جانا ہے۔

جب کہ اس کی جمع کردہ ساری کی ساری دولت وثروت اور زمین و جائداد یہیں کی

یہیں رہ جائے گی، جس سے دوسرے تو عیش و آرام حاصل کریں گے، اور اسے ربّ ذوالجلال کی بارگاہ میں ایک ایک پائی کا حساب دینا ہوگا کہ کہاں سے کمایا تھا اور کہاں خرچ کیا تھا۔ اور کون ہے جو اس کے سامنے حساب دے پائے گا۔

اگر وہ اس حقیقت کو ذہن نشین رکھے، جب کہ آئے دن اعزاء واقرباء کی موت اس حقیقت کو یاد دلانے کے لیے کافی ہے، تو یقین ہے کہ ظلم کا ہاتھ رک جائے حرص وطمع کے بجائے استغناء وتوکل کی صفت پیدا ہو جائے، اور انسان کو انسانیت کی زندگی نصیب ہو جائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بار بار امت کو اس جانب متوجہ کیا اور موت کی یاد دلا کر عمل صالح کی نصیحت کی، چناں چہ ایک موقع پر صحابہ کرام کو خطاب کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”أيها الناس! كان الموت فيها على غيرنا قد كتب و كان الحق فيها على غيرنا قد وجب كان الذي تشيع من الأموات سفر عما قليل إلينا راجعون نبوئهم أجداثهم و نأكل من تراثهم كانا مخلدون بعدهم و نسينا كل واعظة و أمنا كل جائحة، طوبى لمن شغله عيبه عن عيوب الناس، طوبى لمن أنفق مالا اكتسبه من غير معصية و جالس أهل الفقه و الحكمة و خالط أهل الذل و المسكنة، طوبى لمن زكت و حسنت خليقته و طابت سريرته، و عزل عن الناس شره، طوبى لمن أنفق من ماله و أمسك الفضل من قوله و وسعته السنة و لم تشتهوه البدعة. (كنز العمال)

لوگو! (ہماری غفلت کا یہ حال ہے) گویا موت ہمارے لیے نہیں بلکہ فقط دوسروں کے لیے مقرر ہو چکی ہے، اور گویا حقوق کی ادائیگی ہم پر نہیں، بلکہ تنہا دوسرے لوگوں پر واجب ہے، اور جن مردوں کے ساتھ ہم قبرستان تک آتے ہیں، گویا وہ چند دن کے مسافر ہیں جو واپس ہو کر ہم سے ملیں گے، ہم ان کو تو قبر میں دفن کر دیتے ہیں اور ان کا مال ایسے

اطمینان سے کھاتے ہیں گویا ہم کو ان کے بعد دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے، نصیحت کی ہر بات ہم بھلا بیٹھے اور ہر آفت کی طرف سے مطمئن ہو چکے، مبارکباد ہے اس شخص کے لیے جو اپنے عیوب پر نظر کر کے دوسروں کی عیوب جوئی سے بچ رہا، مبارکباد ہے اس کے لیے جس نے حلال کی کمائی خدا کی راہ میں خرچ کی، علماء اور عقلمندوں کی ہم نشینی اختیار کی، اور غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ ملتا جلتا رہا، مبارک ہے وہ شخص جس کے اخلاق اچھے ہوں، دل پاکیزہ ہو اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھے، مبارک ہے وہ شخص جو ضرورت سے بچا ہوا مال خدا کی راہ میں خرچ کرے اور فضول گفتگو سے پرہیز کرے، راہ شریعت پر عمل کرنا اس کے لیے آسان ہو اور بدعت اسے اپنی طرف راغب نہ کر سکے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو اعمالِ صالحہ کی توفیق عطا فرمائے اور اعمال سیئہ سے محفوظ رکھے۔
(آمین)

معاشرتی حقوق ادا کیجئے

تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں،سب کا مذہب ایک ،رسول ایک ، کتاب ایک ،اس اعتبار سے بھی ایک دوسرے پر کچھ حقوق لازم ہوتے ہیں،معاشرتی طور پر ہر مسلمان کے لیے جن کی تکمیل ضروری ہے،ورنہ وہ جماعت مسلمین میں رہنے کا حق دار نہیں،وہ حقوق کیا ہیں،ملاحظہ ہو:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لِلْمُؤْمِنِ علیٰ الْمُؤْمِنِ سِتُّ خِصَالٍ یَعُودُہٗ اِذَا مَرِضَ وَیَشْھَدُ ہٗ اِذَا مَاتَ وَیُجِیْبُہٗ اِذَا دَعَاہُ وَیُسَلِّمُ علیہ اِذَا لَقِیَہ وَیُشَمِّتُہٗ اِذَا عَطَسَ وَیَنْصَحُ لَہٗ اِذَا غَابَ اَوْ شَھِدَ. (النسائی)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:مسلمان پر مسلمان کے چھ حق ہیں:جب کوئی مسلمان بیمار ہوتو دوسرا مسلمان اس کی عیادت کرے۔جب کوئی مسلمان وفات پاجائے تو دوسرا مسلمان اس کی نماز جنازہ میں شریک ہو۔جب (کوئی مسلمان) کھانے پر بلائے تو (بلایا جانے والا مسلمان) اس کی دعوت کو قبول کرے۔جب (کوئی مسلمان) ملے تو اس کو سلام کرے۔جب کوئی مسلمان چھینکے تو اس کا جواب دے۔(ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی ہر حالت میں) خیر خواہی کرے خواہ وہ حاضر ہو یا غائب۔

ان چھ امور کی تفصیل یہ ہے:

اوّل یہ کہ کوئی بھی مسلمان بیمار ہوتو خواہ رشتہ دار ہو یا نہ ہو،اخوت اسلامی کے تعلق کی بنا پر،دوسرے مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ اس کی عیادت کے لیے جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی مریضوں کی عیادت اور انکی مزاج پرسی کیا کرتے تھے اور اس سلسلہ میں دوست ودشمن ،مومن وکافر،امیر وغریب اور آزاد وغلام کسی کی قید

نہیں تھی ہر ایک کے یہاں مزاج پرسی کے واسطے جایا کرتے تھے۔

دوسرے یہ کہ جب کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے تو دوسرے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ اس کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوں اور نماز جنازہ پڑھیں۔

تیسرے یہ کہ جب کوئی مسلمان دعوت دے اور کھانے پر بلائے تو بلائے جانے والے مسلمان کا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس کی دعوت کو قبول کرے۔ بشرطے کہ کوئی شرعی عذر مانع نہ ہو یعنی اس دعوت میں خلاف شرع امور نہ کیے جارہے ہوں، مثلاً: ناچ گانا اور باجا وغیرہ ہو، یا اس دعوت کا تعلق اظہار فخر وریاکاری سے ہو۔

چوتھے یہ کہ جب کسی مسلمان سے ملاقات ہو تو سلام کرے۔ سلام کا تعلق، شناسائی کے حقوق سے نہیں ہے، کہ جس کو پہچانتا ہو اس سے سلام ودعا رکھے، جس کو نہیں پہچانتا اس سے سلام تک نہ کرے۔ بلکہ یہ ان حقوق میں سے ہے جو اسلام نے ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے تئیں عائد کئے ہیں، اس لیے ہر مسلمان بھائی پر لازم ہے کہ جب دوسرے مسلمان بھائی سے ملاقات ہو تو اس سے سلام کرے اور خیریت دریافت کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب سوال کیا کہ اہل اسلام کی کون سی خصلت بہتر ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

”تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتُقْرِئُ السَّلامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ“.

(متفق علیہ)

(کھانا کھلانا اور ہر شناسا و ناشناسا کو سلام کرنا۔)

پانچویں یہ کہ جب کوئی مسلمان چھینکے اور ”الحمد للہ“ کہے تو سننے والے پر لازم ہے کہ اس کے جواب میں ”یرحمک اللہ“ کہے اور اگر چھینکنے والا ”الحمد للہ“ نہ کہے تو وہ جواب کا مستحق نہیں ہوگا۔

چھٹا حق یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی ہر حالت میں خیر خواہی کرے خواہ وہ حاضر ہو یا غائب۔ یعنی مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ ہر حالت میں ایک دوسرے کے خیر خواہ و ہمدرد رہیں، جو مسلمان سامنے ہے ان کے ساتھ بھی خیر خواہی کی

جائے اور جو نظروں سے دور ہیں ان کے ساتھ بھی خیر خواہی کریں۔ یہ طرز عمل اختیار نہ کرنا چاہئے کہ جب کسی مسلمان کے سامنے آئے تو اس کے ساتھ خوشامد و چاپلوسی کا رویہ اپنائے اور جب وہ سامنے نہ ہو تو غیبت کرے، یہ خالص منافقانہ رویہ ہے اور منافقوں کی خاصیت ہے۔

والدین کی خدمت کیجئے

اس دنیا کے معاشرہ کی صلاح وفلاح دراصل باہمی حقوق کی نگہداشت، تعلق و قرابت کی پاسداری، ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور احسان وبھلائی کے برتاؤ اور اس حسن سلوک میں فرق مراتب کے احساس پر منحصر ہے، شریعت اسلامی کا تقاضا ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ جس تعلق وقرابت کا رشتہ رکھتا ہے اور اس تعلق وقرابت میں جو فرق مراتب ہے ادائیگی حقوق اور حسن سلوک کے باہمی معاملات میں اس کا لحاظ رکھے۔

ظاہر ہے کہ قرابت کے اعتبار سے ماں باپ کا رشتہ سب سے زیادہ گہرا اور ان کا تعلق سب سے زیادہ قریب تر ہوتا ہے، لہٰذا کسی شخص کے احسان وحسن سلوک اور خدمت گزاری کی سب سے زیادہ مستحق جو ذات ہوسکتی ہے وہ ماں باپ کی ذات ہے، اس میں بھی تقدیم ماں کو ہے، ماں کے بعد باپ ہے اور پھر دوسرے قرابتی اور رشتہ دار، لیکن ان قرابت داروں اور رشتہ داروں میں بھی تعلق وقرابت کے درجات ومراتب کی رعایت کی جائے گی، جو رشتہ دار اپنے رشتہ کے اعتبار سے جتنا زیادہ نزدیک اور قریب ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ مقدم رکھا جائے گا۔

ماں باپ کے حقوق کی فہرست بہت طویل ہے بلکہ ان کے مرتبہ و درجہ کو دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اولاد اگر اپنی پوری زندگی بھی ان کے حقوق کی ادائیگی میں صرف کردے، تب بھی ان کے احسان کو نہیں ادا کرسکتا۔ بہر حال شریعت نے کچھ چیزیں ایسی بیان کردی ہیں جو زیادہ اہمیت کی ہیں اور جن کا لحاظ بہر صورت ہونا چاہئے مثلاً سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ان کی جائز خواہشات کی تکمیل اور ان کی اطاعت وفرماں برداری کو

لازم جانا جائے اور ان کی رضا وخوشنودی کو اپنے حق میں بڑی سعادت سمجھی جائے ، اپنی حیثیت واستطاعت کے بقدر ان کی ضروریات، ان کے آرام وراحت میں اپنا مال واسباب خرچ کیا جائے اور ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے جو ان کی شان کے مطابق ہو۔

اولا دان کے سامنے تواضع وانکساری اختیار کرے، ان کے سامنے ملائمت ونرمی اور خوشامد وعاجزی کا رویہ اپنائے اور جہاں تک ہو سکے ان کی خدمت کرے، ان کو خوش رکھے اور ان کی اطاعت وفرماں برداری کو اپنا ذاتی حق سمجھے، اس سلسلے میں کوئی کوتاہی اور سستی نہ کرے۔

ان کے ساتھ کوئی ایسا رویہ نہیں اپنانا چاہئے جس سے ان کی شان میں بے ادبی وگستاخی ظاہر ہوتی ہو اور ان کے ساتھ تکبر وانانیت کے ساتھ پیش نہیں آنا چاہئے ، خواہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں، بات چیت کے وقت اپنی آواز کو ان کی آواز سے اونچی نہ کرنا چاہئے ، اور نہ ان کا نام لے کر ان کو یاد و مخاطب کرنا چاہئے ، کسی کام میں ان سے پہل نہ کرنا چاہئے اور نہ ان کے مقابلہ پر خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

والدین کے حقوق کی نگہداشت اور ان کی خدمت گذاری کی ترغیب دیتے ہوئے ایک موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”رَغِمَ اَنْفُهٗ رَغِمَ اَنْفُهٗ رَغِمَ اَنْفُهٗ قِيْلَ مَنْ يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ مَنْ اَدْرَکَ وَالِدَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا ثُمَّ لَمْ يَدْخُلِ الجَنَّةَ.

(رواہ مسلم)

(خاک آلود ہو ناک اس شخص کی ، خاک آلود ہو ناک اس شخص کی ، خاک آلود ہو ناک اس شخص کی'' (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ گویا یہ بددعا فرمائی کہ وہ شخص ذلیل وخوار ہو) پوچھا گیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کون شخص؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شخص جو اپنے والدین میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پائے اور پھر جنت میں داخل نہ ہو۔)

یعنی جس شخص کے ماں باپ یا دونوں میں کوئی ایک بڑھاپے وکمزوری کی حالت

میں ہوں، اور خدمت کے محتاج وضرورت مند ہوں، پھر اولاد ان کی خدمت کر کے ان کو راضی اور خوش نہ رکھے تو وہ انتہائی بدقسمت ہے کیوں کہ ماں باپ کی خدمت خصوصا جب کہ وہ بوڑھے اور خدمت کے محتاج ہوں بڑے اجر کی بات ہے اور جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے۔ اب معمولی سی خدمت کر کے جنت جیسی دولت ونعمت کو حاصل نہ کرنا اوراس سے محروم رہ جانا یقینا بڑی بدقسمتی اور محرومی کی بات ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ خدمت ہی کے دائرے میں علاج بھی آئے گا کہ اگر وہ بیمار ہو جائیں تو اولاد پر بقدر وسعت علاج کرانا اور تیمار داری کرنا ضروری ہے۔ وسعت کے باوجود اگر علاج نہیں کیا تو گنہ گار ہوگا۔

ایک دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"قَالَ رَجُلٌ یَارَسُولَ اللّٰہِ مَنْ اَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِیْ قَالَ اُمُّکَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمُّکَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمُّکَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اَبُوْکَ.

(متفق علیہ)

(ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری اچھی رفاقت (یعنی میری طرف سے حسن سلوک واحسان اور خدمت گزاری) کا سب سے زیادہ مستحق کون شخص ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہاری ماں"۔ اس نے عرص کیا کہ پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہاری ماں"۔ اس نے عرض کیا کہ پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہاری ماں"۔ اس نے عرض کیا کہ پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمہارا باپ"۔

بعض حضرات نے اس حدیث کے الفاظ سے ایک مسئلہ یہ نکالا ہے کہ کسی شخص پر والدین کے ساتھ حسن سلوک اور بھلائی کرنے کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں ماں کا حصہ باپ سے تین گنا بڑھا ہوا ہے، کیوں کہ وہ حمل کا بوجھ اٹھاتی ہے، ولادت کی تکلیف ومشقت اور دودھ پلانے کی تکلیف برداشت کرتی ہے۔

فقہ کی کتاب میں لکھا ہے کہ اولاد پر ماں کا حق باپ کے حق سے بڑا ہے اوراس کے

ساتھ حسن سلوک وبھلائی اور اس کی خدمت ودیکھ بھال کرنا زیادہ واجب اور زیادہ ضروری ہے اور اگر ایسی صورت پیش آجائے جس میں بیک وقت دونوں کے حقوق کی ادائیگی دشوار ہوجائے مثلاً ماں باپ کے درمیان کسی وجہ سے ان بن ہو، اب لڑکا اگر ماں کے حقوق کی رعایت کرتا ہے تو باپ ناراض ہوتا ہے اور اگر باپ کے حقوق کا لحاظ کرتا ہے تو ماں کو تکلیف ہوتی ہے، تو ایسی صورت میں یہ درمیانی راہ نکالی جائے کہ تعظیم واحترام میں تو باپ کے حقوق کو فوقیت دے اور خدمت گزاری نیز مالی امداد وعطا میں ماں کے حق کو فوقیت دے۔

واضح رہے کہ والدین کی اطاعت وفرماں برداری ان ہی امور میں کی جائے گی جو مباح ہوں، اگر وہ کسی ناجائز یا حرام کام کا حکم کریں تو پھر ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اگر والدین غیر شرعی امور کے مرتکب ہوں، تو ان کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کے وقت بھی ادب واحترام اور نرمی وملائمت کی راہ اختیار کی جائے گی، ایک دفعہ کہنے پر وہ باز نہ آئیں تو پھر سکوت اختیار کرلیا جائے اور ان کے حق میں دعا واستغفار کرتے رہنا چاہئے۔

یہی نہیں کہ اسلام نے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی ترغیب دی ہے، اور ان کی خدمت واطاعت کو دخول جنت کا ذریعہ بتلایا ہے بلکہ والدین کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تعلیم دی ہے اور اسے بھی والدین ہی کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ارشاد نبوی:

”عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ مِنْ اَبَرِّ الْبِرِّ صِلَةَ الرَّجُلِ اَهْلَ وُدِّ اَبِيْهِ بَعْدَ اَنْ يُوَلِّيَ. (رواہ مسلم)

(حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے اعلیٰ نیکیوں میں سے ایک اعلیٰ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ کے مرنے کے بعد یا اس کی غیر موجودگی میں اس کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کرے۔)

یعنی اگر کسی کا باپ مر گیا ہو یا سفر میں گیا ہو، اور اس کے دوست احباب، یا ملنے جلنے والے آ جائیں تو ان کے ساتھ احسان ومروت کا معاملہ کرنا اور حسن سلوک کا برتاؤ کرنا چاہئے۔ ان کے ساتھ حسن سلوک گویا اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہے۔ اور اس کا یہ معاملہ چوں کہ اپنے باپ کی غیر موجودگی میں ہوگا اس لیے وہ بہترین اور اعلیٰ نیکی کرنے والا شمار ہوگا۔

حدیث شریف میں صرف باپ کے دوستوں کا ذکر کرنا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ماں کی سکھی سہیلیوں کے ساتھ احسان وحسن سلوک بدرجۂ اولیٰ ایک بہترین نیکی ہوگی، اس لیے کہ ماں کا حق باپ سے بڑھا ہوا ہے۔

رشتہ داروں کو فراموش نہ کیجئے

اسلام اپنے ماننے والوں پر یہ ذمہ داری بھی عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں اور متعلقین کی خبر گیری رکھے، ایک دوسرے کی قرابت و تعلق کا لحاظ کرے، اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے، اس بات سے بے پرواہ ہو کر کہ وہ رشتہ دار اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے، اور اس کو انسان کا احسان نہیں بلکہ اس کا فرض بتایا گیا ہے۔ جو لوگ رشتوں کو توڑتے ہیں، اور اختلاف و انتشار کی راہ اپناتے ہیں قرآن انہیں فاسق کہتا ہے۔

''وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلاَّ الْفَاسِقِيْنَ. الَّذِيْنَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللّٰهِ مِن بَعْدِ مِيْثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَن يُوصَلَ'' (البقرة)

(اور اس سے وہ انہیں کو گمراہ کرتا ہے، جو حکم نہیں مانتے، جو اللہ کا عہد باندھ کر توڑتے ہیں اور اللہ نے جس کو جوڑنے کو کہا ہے اس کو کاٹتے ہیں۔)

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کے اس فطری گرہ کی تشریح یوں فرمائی ہے:

''رحم (شکم مادر) رحمان (اللہ کا صفاتی نام) سے مشتق ہے اس لیے محبت والے خدا نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا کہ جس نے تجھ کو ملایا اس کو میں نے ملایا، جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا''۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جو مجھے جنت میں لے جائے، فرمایا: اللہ کی بندگی کرو، کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ، نماز پوری ادا کرو، زکوٰۃ دو اور قرابت کا حق (صلہ رحم)

ادا کرو۔

قرآن کی ایک جامع اور مشہور آیت میں، جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبات کے آخر میں تلاوت فرمایا کرتے تھے، اس میں اقرباء کے ساتھ حسن سلوک کی اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی:

''اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی'' (النحل)

(اللہ تعالیٰ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا۔)

یعنی سب کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک روا رکھا جائے اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کیے جائیں، جس میں حسب استطاعت رشتہ داروں کی مالی وجسمانی خدمت اور ملاقات وخبر گیری کے علاوہ ہدیہ اور تحائف دینا اور قبول کرنا، ملاقات کرنا، عیادت اور تعزیت بھی شامل ہے۔

حضرت سلمان ابن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ عام مسکینوں اور فقیروں کو دینے میں تو صرف صدقہ کا ثواب ملتا ہے اور اگر اپنے ذی رحم رشتہ داروں کو دیا جائے تو اس میں دو ثواب ہیں، ایک صدقہ کا دوسرا صلہ رحمی کا۔

قرآن حکیم نے صلہ رحمی کی بڑی تاکید فرمائی ہے، اسے انسانیت و دینداری کی ایک بنیادی اینٹ قرار دیا ہے، اور احادیث رسول نے اسے ایمان کا لازمہ بتایا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو کوئی اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہئے کہ وہ صلہ رحمی کرے''۔

ایک دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''رحمی رشتے کاٹنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔

حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''جو شخص رحم کو جوڑے گا میں اس سے جڑوں گا اور جو شخص رحم کو کاٹے گا میں اس

سے کٹوں گا۔‘‘

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی پیش نظر رہے:

’’لَیْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُکَافِیِٔ وَلٰکِنَّ الْوَاصِلَ اَلَّذِیْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُہٗ وَصَلَھَا‘‘(البخاری)

(کامل) صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص نہیں ہے جو بدلہ چکائے بلکہ (کامل) صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کی قرابت منقطع کی جائے تو وہ اس قرابت کو قائم رکھے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے اس قرابت دار کے ساتھ بدلے کے طور پر احسان اور نیک سلوک کرتا ہے جس نے اس کے ساتھ احسان اور نیک سلوک کیا ہے تو کوئی کمال کی بات نہیں ہے، محسن کے ساتھ تو حسن سلوک ہر ایک کرتا ہی ہے، اس لیے اس کو صلہ رحمی نہیں کہیں گے، بلکہ احسان چکانا کہیں گے، ہاں اگر اس نے ایسے قرابت دار کے ساتھ احسان اور نیک سلوک کیا جس نے خود اس کی قرابت کا کوئی لحاظ روا نہیں رکھا ہے اور کبھی اس کے ساتھ کوئی احسان اور نیک سلوک نہیں کیا ہے تو اس وقت احسان و نیک سلوک بے شک کامل صلہ رحمی کہلائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ صلہ رحمی کا کامل ترین جذبہ وہ ہے جس کی بنیاد بدلہ چکانے پر نہ ہو، بلکہ محض حق شناسی اور حق کی ادائیگی کے احساس پر ہو، خواہ خود اس کا حق کسی نے ادا کیا ہو یا ادا نہ کیا ہو۔ علماء نے لکھا ہے کہ جواں مرد وہی شخص ہے جو اپنا حق کسی سے طلب نہ کرے اور خود دوسروں کا حق ادا کرے۔

یتیموں کے سروں پر دستِ شفقت رکھیئے

اگر ہم اپنے آس پاس کے لوگوں اور معاشرے میں موجود افراد پر نظر ڈالیں تو سب سے زیادہ مفلوک الحال بے بس و بے کس، بے سہارا و بے یار و مددگار، اور سب سے زیادہ دوسروں کے حسنِ سلوک، رواداری، شفقت اور رحم وکرم کا محتاج طبقہ جو ملے گا وہ یتیموں کا ہے۔ یعنی وہ بچہ جو اپنے شفیق باپ کے سایہ سے محروم ہو گیا ہو۔

ایسے بچوں کو بے سہارا سمجھ کر ہر ایک ظالم اور دنیا کا حریص شخص بڑے سکون سے تختۂ مشق بنانے کی تگ ودو میں لگ جاتا ہے، بے وجہ اسے ذلیل ورسوا کرتا ہے، بے گار لیتا ہے، معمولی معمولی باتوں پر غصہ ہو کر مارتا ہے، کام کرا کر پیسے نہیں دیتا اور اگر اس کا باپ وراثت میں زمین جائیداد اور مال ودولت کچھ چھوڑ کر گیا ہے تو خاندان کے ہر ظالم شخص کی آخری تمنا یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کے مال کو ہڑپ لے اور بچے کو اس کے باپ کی دولت سے محروم کر دے۔ آئے دن اخبارات میں اس طرح کی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں کہ زمین جائیداد کے لیے کسی یتیم کو اس کے خاندان اور رشتہ داروں ہی میں سے کسی نے قتل کر دیا یا اس کے مال پر قبضہ کر کے اسے بے دخل کر دیا۔ یہ انتہائی افسوس ناک صورتِ حال ہے، جس کی اسلام قطعاً اجازت نہیں دیتا۔

اسلام نے ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک، رواداری اور عدل وانصاف کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن یتیموں کے ساتھ اس کی مزید تاکید فرمائی ہے، اس لیے کہ دوسروں کے مقابلے میں وہ سب سے زیادہ حسن سلوک کا محتاج ہے، اور اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے دفاع کی طاقت بھی نہیں رکھتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''انی احرج حق الضعیفین الیتیم والمرأۃ'' (ریاض الصالحین)

(میں نے لوگوں کو ان دو کمزوروں: یتیم اور عورتوں کے حقوق کے بارے میں سخت تنبیہ کی ہے۔)

جو لوگ یتیموں کو جھڑکتے اور پریشان کرتے، ان کا خیال نہیں رکھتے، قرآن کریم نے ایسوں کو سخت وعید سنائی ہے، کفارِ عرب زمانۂ جاہلیت میں یتیموں کے ساتھ سخت بدسلوکی کرتے تھے۔ قرآن ان لوگوں کے سلسلے میں ایک جگہ کہتا ہے:

''أَرَأَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ. فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ''

(الماعون)

(کیا آپ نے اس کو دیکھا جو انصاف کو جھٹلاتا ہے، سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے)

قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ ان متولیوں کے کردار کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو یتیموں کے مالوں کو ہڑپ کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے اور ان کے ساتھ سختی و بدسلوکی کا معاملہ کرتے تھے:

''كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ۔ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ۔ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا۔ وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا'' (الفجر)

(نہیں یہ بات نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دنیا کے مال و دولت پر جی بھر رکھتے ہو۔

جو لوگ یتیموں کے مالوں پر قبضہ کر کے کھا جاتے ہیں، ان کے سلسلے میں فرمایا گیا کہ وہ مال و دولت نہیں بلکہ آگ بھر رہے ہیں اپنے پیٹوں میں اور ایسوں کا عذاب جہنم سے بچنا بہت مشکل ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۧ (النساء:۱۰)

(جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں، دراصل وہ اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں)

روایت ہے کہ یتیم کا مال ناحق کھانے والا قیامت کے روز اس حالت میں اٹھایا جائے گا کہ پیٹ کے اندر سے آگ کی لپٹیں اس کے منہ، ناک، کانوں اور آنکھوں سے نکل رہی ہوں گی۔

یتیموں کے وارثین اور خاندان کے ولیوں کو قرآن کا واضح حکم ہے:

''وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ إِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ أَشُدَّهٗ''.

(الأنعام:۱۵۲)

(بہتری کے غرض کے سوا یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ اپنے سن شعور کو پہنچ جائیں)

واضح رہے کہ یتیموں کی مالی مدد اور ان کی کفالت کے لیے جو مدارس اور رفاہی ادارے چندہ جمع کرتے ہیں، وہ جمع شدہ مال بھی یتیموں ہی کا ہے۔ اس میں خرد برد کرنا، یا کسی دوسرے کام میں استعمال کرنا یہ بھی ان کے مال کو کھانا قرار پائے گا، اور مذکورہ وعید کا مصداق ہوگا۔

یتیموں کی خبر گیری اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے اہل مدارس کا سابقہ کردار یقینا بہت اچھا رہا ہے اور اس حوالے سے وہ کافی کامیاب رہے ہیں، لیکن ناس ہو مادّیت اور حرصِ دولت کا کہ اس نے ہر ایک کو متأثر کیا ہے اور اب دیکھنے میں یہ آ رہا ہے کہ اہل مدارس کی بھی توجہ ایسے بچوں کی عمدہ تعلیم و تربیت پر کم، زمین کی خریداری اور بڑی بڑی عمارتوں کی تعمیر پر زیادہ ہو رہی ہے، جو یقینا قابل افسوس ہے۔

آج ضرورت ہے کہ یتیموں کے حقوق کو مکمل طور پر ادا کرنے کے لیے لوگوں کو متوجہ کیا جائے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کے پیغام کو عام کیا جائے اور ان کی فلاح و بہبود نیز تعلیم و تربیت کے لیے اچھے انتظامات کیے جائیں۔ کیوں کہ وہ بھی ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں اور دوسروں کے مقابلے میں ان اقدامات کے زیادہ مستحق ہیں۔

بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کیجئے

دنیائے انسانیت کی بقا، اس کا استحکام اور نسل انسانی کا وجود مرد وعورت کے باہمی ارتباط اور خوش گوار تعلقات پر منحصر ہے، یہ تعلق جس قدر گہرا اور محبت وشفقت سے لبریز ہوگا، اسی قدر اس کا نتیجہ بھی بہتر اور نفع بخش ہوگا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ معاشرے کی اصلاح موقوف ہے فرد کی اصلاح پر اور فرد کی اصلاح موقوف ہے میاں بیوی کے آپسی تعلقات کے خوش گوار ہونے پر۔ کیوں کہ گھر میں پلنے والے بچے کی اخلاقی تربیت (جو کل معاشرے کا ایک فرد اور حصہ ہوگا) منحصر ہے گھر کے ماحول پر، اگر بچے کے ماں باپ یعنی میاں بیوی کے درمیان اچھے اور خوش گوار تعلقات ہوں، گھر کا ماحول لڑائی جھگڑا، کینہ بغض اور ظلم وزیادتی سے پاک وصاف ہوگا تو اس کے اچھے اثرات گھر میں پلنے والے بچے پر بھی پڑیں گے اور وہ ایک اچھا بھائی، اچھا شوہر، اچھا پڑوسی بلکہ اچھا انسان بنے گا اور اگر آئے دن گھر میں مار پیٹ، لڑائی جھگڑا، گالم گلوچ کا سلسلہ رہے گا تو بہت مشکل ہے کہ اس گھر میں پرورش پانے والے بچے کی اصلاح ہوسکے۔

زندگی کا سکون اور دل کا اطمینان بڑی حد تک خوشگوار ازدواجی زندگی سے وابستہ ہے، شادی کا مقصد میاں بیوی کے لیے پاکیزگی کے ساتھ زندگی کی راحتوں اور مسرتوں کا حصول ہے، شادی سے انسان آوارگی اور پراگندگی سے محفوظ ہوکر باعزت اور باوقار زندگی حاصل کرتا ہے۔ اگر فریقین میں محبت اور یگانگت نہ ہو تو یہ مضبوط رشتہ بھی دونوں کو مسرت اور راحت سے ہم کنار نہیں کرسکتا۔

اس لیے اسلام اس بات پر بہت زیادہ زور دیتا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے حقوق کا بھرپور لحاظ رکھیں، اور کسی بھی صورت میں عدل وانصاف کے تقاضے کو ہاتھ

سے نہ جانے دیں۔ چنانچہ اسلام نے جہاں عورت کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ شوہر کی اطاعت، خدمت اور دلجوئی کو لازم سمجھے وہیں مرد کو بھی پابند کیا ہے کہ اس کے ساتھ نیک برتاؤ اور پیار محبت کا معاملہ کرے۔

عورت کوئی خریدی ہوئی باندی یا باتنخواہ ملازمہ نہیں ہے بلکہ مرد کی زندگی کا سکون اور سامان راحت ہے، جسے اس نے ایک عہد و پیمان کے ذریعہ حاصل کیا ہے، جس کی وجہ سے اس نے ماں کو چھوڑا، باپ کو الوداع کہا، بھائی اور بہنوں سے رخصت ہوئی، گھر اور خاندان سب کو خیر باد کہا اور اس کی رفیقۂ حیات بن کر اس کے چمن حیات کو گل گلزار بنایا، اس کے لیے پھولوں کا سیج سجایا اور اس کی راہوں میں محبت کے پھول برسائے۔ اس کا بہترین صلہ یہ ہے کہ شوہر اس کے ساتھ حسن معاشرت قائم رکھے، جو کھائے وہ کھلائے، جو پہنے وہ پہنائے، جہاں رہے ساتھ رکھے، اس کی دلداری کرے، اسے خوش رکھے، اپنے اعزاء و اقرباء کی طرح اس کے رشتہ داروں کا بھی خیال رکھے۔

اسلام نے میاں بیوی کے باہمی حقوق اور ذمہ داریوں کے بارے میں ایسی بیش بہا ہدایات دی ہیں، جن پر عمل پیرا ہو کر میاں بیوی ایک دوسرے کے دل کا قرار اور آنکھوں کی ٹھنڈک بن سکتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں خواتین کے ساتھ حسن سلوک اور دل جوئی کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا:

''وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ''(النساء)

اور ان کے ساتھ بھلے انداز میں زندگی بسر کرو۔

یہاں بطور حکم ارشاد باری ہو رہا ہے کہ بیوی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ حسن معاشرت قائم رکھو، یہ کسی خاص حالت میں نہیں، جوانی میں بھی، بڑھاپے میں بھی، وہ حسین و جمیل ہو تو بھی اور حسن و جمال سے محروم ہو تو بھی، ڈھیروں مال لے کر آئے جب بھی اور خالی ہاتھ آئے جب بھی، وہ بھی عزت رکھتی ہے، شوہر کی آمدنی پر حق رکھتی ہے، حیثیت و مرتبہ رکھتی ہے۔ لازم ہے کہ لحاظ رہے اس کی عزت کا، حیثیت کا، اور مرتبے کا۔

جیسے مرد کے حقوق عورت کے ذمے ہیں اسی طرح عورت کے حقوق مرد کے ذمے ہیں اور کیوں نہ ہوتے جب خلقت دونوں کی ایک رکھی گئی اور خلقت کی یکسانی کا گواہ کوئی دوسرا نہیں خود خالق کائنات ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اللہ تعالیٰ نے تمہاری بیویاں تم ہی میں سے پیدا کیں۔''

یعنی تمہاری جنس سے۔ اس کی فطرت تمہاری فطرت، اس کی خلقت تمہاری خلقت ہے، تمہیں سیم وزر کی طلب ہے تو وہ بھی احتیاجِ مال سے بے نیاز نہیں رکھی گئی ہے، تم اگر اپنی راحت وآسائش کے بھوکے ہو تو اس کا جسم بھی خستگی اور تھکن کے اثرات کو قبول کرنے والا ہے۔ تمہیں اگر غصہ آتا ہے تو وہ بھی بے حس نہیں پیدا کی گئی۔ تم اگر اپنی جاہ وعزت کے طالب ہو تو وہ بھی توہین ورسوائی سے خوشی نہیں حاصل کرتی۔ تم اگر حکومت چاہتے ہوں تو وہ بھی غلامی کے لیے پیدا نہیں ہوئی۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ (النساء)

(اے انسانو! ڈرو اپنے پروردگار سے، جس نے تمہیں ایک نفس واحد سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور پھر ان دونوں سے اتنے سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں اور ڈرو اللہ سے جس کے نام سے ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے ہو، اللہ سے ڈرو حقوقِ قرابت ضائع کرنے سے بھی، یقیناً وہ تمہارا ہر حال میں نگراں ہے۔)

یعنی سارے انسانوں کی، مرد ہوں یا عورت، اصل ایک ہی ہے۔ ایک جوڑے سے مردوں اور عورتوں کی نسلیں چلی ہیں۔ لہٰذا عورت تو تمہاری جنس کی چیز ہے، تم سے فروتر، پست تر کوئی دوسری جنس نہیں۔ اس کی آفرینش سے یہ غرض نہیں کہ تم اسے باندی بنا کر رکھو، بلکہ وہ تو اس لیے ہے کہ تم اس سے تسکین وراحت، سکونِ خاطر حاصل کرو، اور دونوں کے درمیان رشتہ اور تعلق آقائی اور کنیزی کا نہیں، محبت والفت کا قائم کر دیا گیا۔

حق افسری مرد کو یقینا حاصل ہے، مرد کی فضیلت و برتری بالکل مسلّم و برحق، لیکن جو افسر ہے وہ اپنے حق کا استعمال کس طرح کرے؟ اس کا جواب بھی پیغمبر علیہ السلام کی زبانی سنیے:

حضرت ابو ہریرہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

''نصیحت قبول کرو عورتوں کے بارے میں نرمی کی، اس لیے کہ ان کی خلقت پسلی سے ہوئی ہے، اگر تم درست کرنے کی فکر میں لگے رہے تو اسے توڑ کر رہو گے اور اگر اس کے حال پر اسے رہنے دو گے تو کجی بدستور رہے گی''۔

غور کیجئے کہ عورت کے ساتھ بھلائی اور ملائمت کی تاکید کس درجہ کی ہے، اگر ٹیڑھی پسلی کو کوئی سیدھا کرنے کے درپے ہو جائے تو پسلی بھلا سیدھی ہو سکتی ہے؟ البتہ ٹوٹ کر رہ جائے گی، لیکن اگر کجی کی طرف سرے سے ہی توجہ نہ کی جائے تو خرابی جوں کی توں رہے گی۔ اس لیے ارشاد ہوتا ہے کہ اصلاح کی کوشش میں لگے رہو، لیکن ہمیشہ نرمی، سہولت اور محبت سے۔

ایک دوسری روایت حکیم بن معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

ایک شخص نے خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آ کر عرض کیا کہ شوہر پر بیوی کا کیا حق ہے؟

فرمایا کہ شوہر جب خود کھائے تو اسے بھی کھلائے، جب خود پہنے تو اسے بھی پہنائے، اس میں عیب نہ نکالے (یعنی صورت، سیرت کی ہجو نہ کرے) اور نہ یہ ہو کہ اسے چھوڑ کر کہیں چلا جائے، رکھے بہر حال اسے اسی مکان میں۔ (ابن ماجہ)

ایک طویل حدیث کے آخر میں اس سے زیادہ تاکید اور تصریح کے ساتھ آپ کا ارشاد منقول ہے:

خبردار رہو کہ بیویوں کا حق یہ ہے کہ کھانے اور لباس میں ان کے ساتھ بہتر سے بہتر طریقہ برتو۔

لفظ ''حق'' فرما کر اشارہ اس طرف ہے کہ کوئی رعایت اور احسان نہیں، سسرال

میں بیوی جو کچھ کھاتی ہے اپنے حق سے، جو کچھ پاتی ہیں اپنے حق سے، بھیک مانگنے والی نہیں کہ خیراتی سمجھ کر، ترس کھا کر دو چار پیسے اس کے آگے ڈال دیے، سائل و گداگر نہیں کہ رات کی باسی روٹی کے ٹکڑے اس کے دامن میں پھینک دیے۔ بلکہ بیوی اپنے شوہر کے گھر میں حق دار اور حاکم و مختار ہے:

''وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ'' (البقرۃ)

(اور ان عورتوں کو معروف طریقے کے مطابق ویسے ہی حقوق حاصل ہیں، (جیسے مردوں کو) ان پر حاصل ہیں۔)

درحقیقت عورت کو ہمیشہ پناہ اور مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے، شادی سے قبل اس کا باپ اس کی تمام ذمہ داریاں نبھانے اور اس کی تمام ضروریات پوری کرنے کا پابند ہے اور شادی کے بعد اس کی پوری ذمہ داری اس کے شوہر پر آجاتی ہے، شوہر کے سوا کوئی اور اس سے اتنا قریب نہیں ہوتا جس سے وہ اپنا دکھ سکھ بیان کرے اور جو اس کے مسائل حل کر سکے، اگر شوہر بھی اس کی ضروریات پوری نہ کرے اور اس کے مسائل کو نہ سمجھے تو پھر وہ کس سے فریاد کرے گی؟ اسی لیے اسلام نے بار بار اس کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی ہے۔

ایک روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

خیر کم خیر کم لأهله و أنا خیر کم لأهلي (ترمذی)

''تم میں بہترین انسان وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہو، اور میں اپنے گھر والوں میں بہتر ہوں۔''

یہ الفاظ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ہیں:

خیار کم خیار کم لنسائهم. (ابن ماجه)

تم میں بہتر وہ ہے جو اپنی عورتوں کے حق میں بہتر ہو۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں اور بچوں سے جو محبت تھی، حضرت انس رضی

اللہ عنہ اس کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

"کان رسول اللہ ارحم الناس بالنساء و الصبیان"

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں اور بچوں کے حق میں سب سے بڑھ کر شفیق ومہربان تھے۔)

نیکی اور بزرگی کا معیار یہ نہیں کہ دفتروں اور کچہریوں میں دوستوں کے مجمع میں، قومی جلسوں میں کون کیسا نظر آتا ہے، بلکہ یہ کہ بیوی کے ساتھ برتاؤ کس کا نرم ہے، گھر کے اندر صبر وتحمل کا ثبوت کون دیتا رہتا ہے، جلوت میں نہیں خلوت میں کون کیسا ہے؟

یہ روایت بھی ملاحظہ ہو:

ایک مسلمان اپنی بیوی کے حق میں جتنا رحم دل اور مہذب ہوگا، اتنا ہی وہ اپنے ایمان میں کامل ہوگا۔

مزید بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دیتے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقا و الطفھم باھلہٖ."

(کامل الایمان آدمی وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں اور جو اپنے بال بچوں کے لیے بدرجۂ غایت شفیق ہو۔)

کوئی مومن بیوی سے بغض نہ رکھے اگر اس کی کوئی خصلت ناپسند ہوگی تو دوسری خصلت ضرور پسند آجائے گی۔ (مسلم)

یعنی شوہر کو یہ سوچنا چاہیے کہ خود اس کے اندر بھی تو بہت سی خامیاں ہیں اور بہت سی ایسی عادتیں ہیں جو بیوی کو ناپسند ہوں گی لیکن وہ وفاشعاری کے ساتھ گزارا کرتی ہے تو شوہر کو بھی بیوی کی خوبیاں نظر میں رکھنی چاہئیں اور اس کی کوتاہیوں اور خامیوں کو وسعت قلبی کے ساتھ نظر انداز کردینا چاہئے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ روک ٹوک نہ کرے اور غلط بات پر تنبیہ نہ کرے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نرمی اور حکمت کے ساتھ سمجھاتا رہے اور نبھاتا رہے، بوقت ضرورت

تھوڑی بہت سختی بھی کی جا سکتی ہے، لیکن سختی کی عادت نہ ڈالے، کیوں کہ یہ شریف النفس لوگوں کا شیوہ نہیں ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے آخری وصیت مسلمانوں کو یہ تھی:

''الصلوٰۃ الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم لا تکلفوھم مالا یطیقون اللہ اللہ فی النساء فانھن عوان فی ایدیکم۔''

(نماز کا التزام کرو اور غلاموں کا خیال رکھو، ایسا نہ ہو کہ تم ان کی طاقت سے زیادہ کام کا ان کو مکلف بناؤ، اور عورتوں کے بارے میں خصوصیت سے اللہ سے ڈرو۔ کیونکہ وہ بیچاریاں سراسر تمہارے قبضہ میں ہیں اور تمہارے رحم وکرم کی اسیر ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقعہ پر تاریخی اور یادگار خطبہ دیتے ہوئے عورتوں کے حقوق کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''اپنی بیویوں سے شفقت اور محبت کا سلوک کرو، تم نے اللہ کی ضمانت پر ان کو اپنے لیے حلال کیا ہے، ان کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، اور ان سے بہتر سلوک کرو۔''

الحاصل شوہر پر لازم ہے کہ بیوی کے ساتھ پیار ومحبت اور حسن سلوک کا برتاؤ کرے، اس کے عیوب سے چشم پوشی کرے، خطاؤں سے درگزر کرے، بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ نہ کرے، غصہ کے وقت پچھلی برائیوں کو یاد نہ دلائے، گھر کے داخلی امور جو اس سے متعلق ہوں ان میں بہت زیادہ مداخلت نہ کرے، بلکہ اس پر اعتماد کرے، ضرورت سے زیادہ اس پر ذمہ داری اور بوجھ نہ ڈالے، بات بات پر طلاق کی دھمکی نہ دے، بلاوجہ اس کی عزت اور ناموس کے بارے میں شبہ نہ کرے۔ اسے اپنی زندگی کا ساتھی اور شریک سمجھے۔ خادمہ یا باندی نہ سمجھے، اس کے احساسات کا خیال کرے اور اس کو عزت دے، اس کے دکھ درد کو سمجھے، اس کے لیے سہارا اور پناہ بنے۔

✻ ✻ ✻

عورتیں شوہروں کے حقوق کو پہچانیں

جیسے شوہر پر لازم ہے کہ بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرے، اسی طرح بیوی کی بھی ذمہ داری ہے کہ شوہر کے ہر جائز مطالبہ کو پوا کرے اور اس کی تعظیم وتوقیر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے، جب تک کہ اس مطالبے میں گناہ کا کوئی پہلو نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے شوہر کا بڑا حق رکھا ہے اور عورت پر اسے بہت فوقیت دی ہے۔ عورت کے لیے شوہر کو راضی اور خوش رکھنا بڑی عبادت ہے اور اس کو ناخوش وناراض کرنا بڑا گناہ ہے۔

شوہر کی اطاعت سے متعلق متعدد روایات کتب حدیث میں مذکور ہیں، ایک حدیث میں ہے:

"ایما امرأة ماتت وزوجها عنها راض دخلت الجنة" (ترمذی)

(جو عورت اس حال میں مری کہ اس کا شوہر اس سے خوش تھا، اس کا جنت میں جانا یقینی ہو گیا)

ایک اور حدیث میں ہے:

"اذاصلت المرأة خمسها وصامت شهرها، وحفظت فرجها واطاعت زوجها دخلت الجنة ربها" (ابن حبان)

(جس عورت نے پانچوں وقت کی نمازیں پڑھیں، پورے مہینہ (رمضان) کے روزے رکھے اور عفیف و پاکباز رہی، نیز شوہر کی اطاعت وفرمانبرداری میں بھی سرگرم رہی، تو یہ گویا اپنے پروردگار کی جنت میں داخل ہو گئی۔)

شوہر کی اطاعت واحترام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درجہ اہم قرار دیا ہے کہ اس کے بارہ میں حدیث میں ہے:

"لو امرت احداً ان یسجد لاحد لامرت المرأة ان تسجد لزوجها

من عظم حقه عليها". (ابن حبان)

(اگر میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت دے سکتا تو بیوی سے کہتا کہ شوہر کے حقوق کے پیش نظر اس کو سجدہ کریں۔)

ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ سب سے اچھی عورت کون ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ عورت کہ جب اس کا شوہر اس کی طرف دیکھے تو خوش کردے، جب کچھ کہے تو کہا مانے اور اپنی جان و مال میں کچھ اس کے خلاف نہ کرے جو اس کو ناگوار ہو۔

مرد کا ایک حق یہ ہے کہ عورت بغیر شوہر کی اجازت کے گھر سے باہر کہیں نہ جائے، نہ عزیز اور رشتہ دار کے گھر نہ کسی غیر کے گھر۔ ایسے ہی مرد کا حق یہ بھی ہے کہ عورت اس کے سامنے بن سنور کر، صاف ستھرے لباس پہن کر رہا کرے، اپنی صورت بگاڑ کے اور میلی کچیلی نہ رہے، یہاں تک کہ اگر مرد کے کہنے پر بھی عورت سنگار نہ کرے تو مرد کو مارنے کا اختیار ہے۔

افسوس عورت جسے اپنے شوہروں کے لیے بننے سنورنے اور زیب وزینت کا حکم ہے، وہ گھروں میں تو جیسی تیسی میلی کچیلی پڑی رہتی ہیں، لیکن جب کہیں جانے لگے گی، تو دوسروں کو دکھانے کے لیے اچھے کپڑے پہن کر اور خوب میک اپ کر کے نکلے گی۔ اللہ حفاظت فرمائے، فتنے اسی سے ہوتے ہیں، اور زنا کاری و بدکاری کے راستے اسی سے کھلتے ہیں۔

ازدواجی زندگی میں بیوی کے لیے دو باتیں بہت اہم ہیں:

ایک تو یہ کہ پردہ کی حد درجہ پابندی کرے، غیروں سے ربط ضبط بالکل نہ رکھے، یہاں تک کہ فون پر بھی غیر محرم مردوں سے گفتگو نہ کرے۔ دوسرے اپنے مطالبات کی وسعتوں کا جائزہ لے، اور روز آنہ ایک لمبی چوڑی فہرست نہ تیار کر رکھے، جس کے پورا کرنے سے شوہر عاجز آجائے، یا گھبرانے لگے، بلکہ اپنے مطالبات کو صرف حلال و مباح

کی حدود تک ہی منحصر رہنے دے آگے نہ بڑھائے۔ بہت سی ایسی نیک دل مستورات گذریں ہیں، جو اس پر سختی سے کاربند تھیں، ان کے شوہر یا والد جب کسبِ معاش کی غرض سے سفر پر روانہ ہوتے تو یہ ان سے ان الفاظ میں درخواست کرتیں:

''آپ کسبِ حرام سے کسی بھی طرح دامن کو آلودہ نہ ہونے دیں، کیونکہ ہمارے لیے یہ تو ممکن ہے کہ قدرے بھوک اور تکلیف پر صبر کرلیں، مگر آگ کو برداشت کرنا ناممکن ہے۔''

ماؤں کو اسلامی اخلاق کا اس درجہ خیال تھا کہ شادی پر خصوصیت سے اپنی بچیوں کو شوہر کی اطاعت کی تلقین کرتیں، چنانچہ اسما بنت خارجہ فزاری نے اپنی بیٹی کو سسرال بھیجتے وقت جو وصیت کی تھی، وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے، فرمایا:

''تو ایک جانے بوجھے آشیانے سے نکلی ہے اور ایسے مکان کو اپنا رہی ہے جسے تو نہیں پہچانتی اور ایسے رفیقِ حیات سے تیرا سامنا ہے جس سے تو مانوس نہیں، سو تجھے چاہئے کہ زمین کی طرح اس کے پاؤں تلے بچھ جاؤ، وہ تمہارے حق میں آسمان بننے کی کوشش کرے گا، فرش کی طرح اپنے کو ثابت کرو، وہ تمہارے لیے ستون ثابت ہوگا، تم لونڈی بن کر رہو، وہ غلام بے دام بن کر رہے گا، کسی مطالبہ پر بھی اصرار نہ کرو، ورنہ بے زار ہو جائے گا، اس سے دور دور نہ رہو، ورنہ وہ بھلا دے گا، وہ اگر قریب آئے تو تم بھی قریب آنے کی کوشش کرو اور اگر وہ دور رہے تو تم بھی اپنے کو دور رکھو، ہر حال میں اس کی عزت، شہرت اور شخصیت کا خیال رکھو، سوائے مہک کے تم سے اور کوئی چیز سونگھنے نہ پائے، اور بجز اچھی بات کے اور کچھ نہ سننے پائے، اسی طرح اس کی نظریں جب بھی اٹھیں جمال اور خوبصورتی پر پڑیں''۔

میاں بیوی کا رشتہ ایسا رشتہ ہے کہ ساری عمر اسی میں بسر کرنا ہے۔ اگر دونوں کے دل پیار و محبت سے لبریز رہے، اور دونوں کا دل ملا ہوا رہا تو اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ اور اگر خدانخواستہ دلوں میں فرق آ گیا اور بُعد پیدا ہو گیا تو اس سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں اس لئے جہاں تک ہو سکے عورت، شوہر کے دل کو جیتے رہے، اپنی محبت میں مشغول رکھے

اوراس کی آنکھوں کے اشاروں پر چلے۔اگر وہ حکم کرے کہ رات بھر ہاتھ باندھے کھڑی رہوتو دنیا و آخرت کی بھلائی اسی میں ہے کہ دنیا کی تھوڑی سی تکلیف گوارا کر کے آخرت کی بھلائی اور سرخروئی حاصل کرے۔کسی وقت کوئی ایسی بات نہ کرے جو اسکے مزاج کے خلاف ہو۔اگر وہ دن کو رات بتلاوے تو عورت بھی دن کو رات کہنے لگے۔کم سمجھی اور انجام سے بے خبر ہونے کی وجہ سے بعض عورتیں ایسی باتیں کر بیٹھتی ہیں جس سے مرد کے دل میں کدورت پیدا ہوجاتی ہے، کہیں بے موقعہ زبان چلا دی، کوئی بات طعنہ وتشنیع کی کہہ ڈالی، غصہ میں جلی کٹی باتیں کہہ دیں، پھر جب شوہر کا دل پھر جاتا ہے تو روتی پھرتی ہیں کہ وہ تو چاہتا ہی نہیں۔حالاں کہ دل میں بُعد پیدا ہوجانے کے بعد اگر دو چار دن میں کہہ سن کر منا بھی لیا گیا تب بھی وہ بات نہیں رہتی جو پہلے تھی۔جب کوئی بات ہوگی تو شوہر کو یہی خیال آئے گا کہ یہ وہی ہے جس نے فلانے فلانے دن ایسا کہا تھا، اس لئے شوہر کے ساتھ خوب سوچ سمجھ کر اور بیداری کے ساتھ رہنا چاہئے کہ خدا اور رسول کی بھی خوشی پیش نظر رہے اور شوہر کی بھی، تاکہ دنیا اور آخرت دونوں درست ہوجائیں۔

اسی کے پیش نظر ''ایک بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ کس طرح رہنا چاہیے'' سے متعلق چند باتیں یہاں ذکر کی جارہی ہیں:

شوہر کی حیثیت سے زیادہ خرچ نہ مانگے جو کچھ ملے اپنا گھر سمجھ کر چٹنی روٹی کھا کر بسر کرے۔کسی بات پر ضد اور ہٹ نہ کرے، اگر شوہر کوئی چیز لا کر دے تو پسند آئے یا نہ آئے ہمیشہ اس پر خوشی ظاہر کرے۔کبھی غصہ میں آکر خاوند کی ناشکری نہ کرے، کہ کہنے لگے اس گھر میں جب سے آئی ہوں، خوشی دیکھی ہی نہیں، اور نا ہی من پسند کوئی چیز ملی ہے، عموماً عورتوں کے منہ سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں، جو شوہر کی تکلیف کا سبب بنتی ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے دوزخ میں عورتیں بہت دیکھیں۔کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ دوزخ میں عورتیں کیوں زیادہ جائیں گی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ دوسروں پر لعنت بہت کیا کرتی ہیں اور اپنے خاوند کی ناشکری بہت کیا کرتی ہیں۔

شوہر کو کسی بات پر غصہ آ جائے تو ایسی بات نہ کہے کہ غصہ اور زیادہ ہو جائے، ہر وقت مزاج دیکھ کر کے بات کرے۔ اسی طرح اگر دیکھے کہ اس وقت شوہر ہنسی اور دل لگی کو پسند کرے گا تو ہنسی دل لگی کرے، ورنہ نہ کرے، جیسا مزاج دیکھے ویسی باتیں کرے۔ اگر شوہر کسی بات پر خفا ہو کر روٹھ جائے تو بھی منہ پھلا کر نہ بیٹھی رہے، بلکہ خوشامد کر کے اس کو منا لے۔ شوہر کو اپنا حاکم سمجھے، اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت میں ادب و تمیز کا پاس اور خیال رکھے، جب تک ساس سسر زندہ رہیں ان کی خدمت کو اور ان کی تابعداری کو لازم جانے اور اسی میں اپنی عزت سمجھے، اور ساس و نندوں سے الگ ہو کر رہنے کی ہرگز فکر نہ کرے۔ کہ ساس نندوں سے بگاڑ ہو جانے کی یہی جڑ ہے۔ ذرا سوچو کہ ماں باپ نے اپنے لڑکے کو پالا پوسا اور اب اس آسرے پر اس کی شادی کی کہ ہم کو آرام ملے گا اور سکون کی روٹی ملے گی۔ لیکن جب بہو آئی تو ڈولے سے اترتے ہی یہ فکر کرنے لگی کہ میاں آج ہی ماں باپ کو چھوڑ دیں، پھر جب ماں کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیٹے کو ہم سے چھڑاتی ہے تو اختلاف ہوتا ہے۔ اللہ حفاظت فرمائے (آمین)

زوجین ایک دوسرے کا لحاظ رکھیں

شادی کے بعد میاں بیوی کے لیے کن کن آداب اور امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اور حسن معاشرت کے سلسلے میں کن ہدایات پر عمل پیرا ہونا ہے؟ یہ بحث ازدواجی زندگی کو اسلامی نقطۂ نظر سے بسر کرنے اور سنوارنے کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔

شریعت اسلامیہ نے خاندان کے احکام پر جتنا زور دیا ہے قرآن وحدیث کے مطالعہ سے بخوبی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہاں تک ارشاد فرمایا ہے کہ:

خير كم خير كم لأهله و أنا خير كم لأهلي. (الحديث)

(تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو اور میں تم سب میں اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ ازدواجی رشتے میں دونوں جانب ایک دوسرے پر کچھ حقوق واجب ہوتے ہیں، اگر ان حقوق کی رعایت رکھی جائے تو گھر نمونۂ جنت ورحمت بن سکتا ہے اور اگر خدانخواستہ ان حقوق کی ادائیگی سے پہلو تہی کی جائے تو یہ پیار ومحبت کا رشتہ رحمت وراحت کے بجائے زحمت ومصیبت بن جاتا ہے۔ علاوہ ازیں حقوق واجبہ کے علاوہ کچھ خاندان، معاشرتی اور استحبابی امور بھی ہیں جن کی رعایت بھی دونوں کے لئے ضروری ہوتا ہے تا کہ یہ پاکیزہ رشتہ مزید مضبوط و مستحکم ہو اور خوشگوار ماحول میں خوشگوار زندگی گزرے۔

اس ازدواجی زندگی اور رشتوں کو استوار اور حسن معاشرت کے معیار کو قائم رکھنے کا بہترین پیمانہ عدل ومساوات ہے، اسی پر زمین وآسمان کی استواریاں قائم ہیں، یہ اگر موجود ہے تو معاشرتی اور خانگی زندگی میں ایک طرح کا انضباط اور ہمواری رہے گی۔ اور

اگر عدل کا فقدان ہوگا تو طرح طرح کے مسائل کا پیدا ہونا لازمی ہے۔عدل کہتے ہیں جس کا جو حق ہے پورا پورا اسے دینا۔شوہر پر عورت کے جو حقوق ہیں اس کی ذمہ داری ہے کہ ان کی مکمل ادائیگی کی کوشش کرے اسی طرح عورت پر شوہر کے جو حقوق ہیں اس کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ بھی ان کی مکمل طور پر ادائیگی کرے۔ارشاد ربانی ہے:

"اعدلو اھو اقرب للتقویٰ"

(عدل کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے)

عدل کے ساتھ ساتھ دونوں کے ذمہ جس اہم امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے وہ ہے حسن خلق وحسن سلوک۔

یعنی معمولی معمولی باتوں سے تنگ دل نہ ہو، اس کی وجہ سے کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے ،جس سے دوسرے کو ایذاء پہنچے، اگر کسی بات پر غصہ آ جائے تو حلم وصبر اور برادشت وعفو کا ثبوت دیا جائے۔حضور اکرم ﷺ کی سنت سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔اور قرآن کریم کی یہی تعلیمات ہیں:

وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا ۝ (النساء:۱۹)

(اور گذران کروان عورتوں کے ساتھ اچھی طرح پھر اگر وہ تم کو نہ بھاویں تو شاید تم کو پسند نہ آوے ایک چیز اور اللہ تعالیٰ نے رکھی ہو اس میں بہت خوبی)

یعنی عورتوں کے ساتھ گفتگو اور معاملات میں اخلاق اور سلوک سے معاملہ رکھو، جاہلیت میں جیسا ذلت اور سختی کا برتاؤ عورتوں کے ساتھ کیا جاتا تھا، اس کو چھوڑ دو، پھر اگر تم کو کسی عورت کی کوئی خو اور عادت خوش نہ آئے تو صبر کرو، شاید اس میں کوئی خوبی ہو اور ممکن ہے کہ تم کو ناپسندیدہ ہو کوئی چیز اور اللہ تعالیٰ اس میں تمہارے لیے کوئی بڑی منفعت دینی یا دنیوی رکھ دے، سو تم کو تحمل کرنا چاہیے اور بدخو کے ساتھ بدخوئی نہ چاہیے۔

حسن خلق ہی کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے سے بلاوجہ بدگمانی نہ پیدا کی جائے ،نہ شوہر کو اس کا حق ہے کہ وہ اپنی رفیقۂ حیات سے بدگمان ہو، اور نہ عورت کو اس کی

اجازت ہے کہ وہ اپنے سرتاج سے بدظنی رکھے۔ بدگمانی، تجسس اور خواہ مخواہ کی ٹٹول و تاک جھانک سے نہایت خوف ناک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں، شریعت میں جس کی گنجائش نہیں ہے۔

حسن سلوک میں یہ بھی داخل ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف رہ کر گھر میں زندگی گذاریں، آپسی گفتگو، ہنسی مذاق، ملاعبت و ملاطفت اس سلسلے میں بہت زیادہ معاون ومفید ہے۔ ایک دوسرے کے تعلق سے جذبۂ ہمدردی، اظہارِ اپنائیت، خبر گیری، شفقت ومحبت وہ امور ہیں جن سے ایک انسان اپنی خانگی زندگی کو گل گلزار بنا سکتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میاں بیوی جب مل جل کر رہیں گے تو کبھی کبھار آپس میں اختلاف و رنجش بھی پیدا ہوگی، بُعد بھی پیدا ہوگا۔ شریعتِ اسلامیہ جو ہر موقع پر انسانوں کی رہنمائی کرتی ہے اور جو دین فطرت ہے، اس سلسلے میں بھی اس کی واضح اور خوب سے خوب تر ہدایات موجود ہیں۔ انھیں میں سے ایک تو یہ ہے کہ رنجش واختلاف کو اولاً حسن خلق سے دفع کیا جائے اگر یہ علاج کارگر نہ ہو تو مل جل کر دونوں مل بیٹھیں اور صلح وصفائی کی کوشش کریں، مناسب حل تلاش کریں، اگر سنجیدہ کوشش کی گئی تو انشاء اللہ اختلاف ورنجش اسی مرحلے میں ختم ہو جائے گی۔ لیکن اگر مسئلہ اس سے بھی حل نہ ہوا تو دونوں اپنے اپنے خاندان کے ذی شعور، مخلص، معاملہ فہم افراد میں سے ایک ایک شخص کو حکم منتخب کرلیں اور پورے معاملے کو ان کے سامنے پیش کردیں، قرآن حکیم ناطق ہے کہ اگر دونوں نے اخلاص کے ساتھ سنجیدہ کوشش کی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دونوں کی غیبی طور پر مدد ہوگی اور ان کے ذریعہ دونوں میاں بیوی کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اتفاق ومحبت پیدا فرما دیں گے۔

ارشادِ باری ہے:

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا

خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾. (النساء:۳۵)

(اور اگر تم ڈرو کہ دونوں آپس میں ضد رکھتے ہیں تو کھڑا کرو ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورت والوں میں سے، اگر یہ دونوں چاہیں گے کہ صلاح کر دیں تو اللہ تعالیٰ موافقت کرادے گا ان دونوں میں۔ بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا خبر دار ہے۔)

اللہ ربّ العزت ہم سب کو اتحاد و اتفاق، بھائی چارگی اور حسن سلوک کے ساتھ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

پردے کورواج دیجئے

حقیقت یہ ہے کہ بے حجابی اور بے پردگی عورت کے لیے مصیبت اور پریشانی کا باعث ہے، جب کہ حجاب اور اسلامی پردہ اس کی عفت وعصمت کی حفاظت کا ضامن ہے، جو اسے ایسا ذہنی سکون و اطمینانِ قلب کا احساس عطا کرتا ہے جس سے یقینا بے حجاب عورتیں محروم رہتی ہیں۔اسلام کے اس نظریے کی تائید مغربی مفکرین نے بھی کھل کر کی، اسلام نے فتنہ کا چشمہ جہاں سے ابلتا تھااور اخلاق وسوسائٹی پر جہاں سے ضرب پڑتی تھی، ان سوتوں اور سوراخوں کو ہی بند کرڈالا۔مقصد یہ ہے کہ عفت وعصمت جو بنی نوعِ انسان کے لیے ایک بیش قیمت موتی ہے، اس کی حفاظت کے لیے تمام جائز طریقے برتنا ضروری اور انسانی فریضہ ہے، تاکہ انسانی سوسائٹی فتنہ وفساد کی آماج گاہ نہ بن سکے اور ملک وشہر کا امن وامان خطرے میں نہ پڑے۔

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اسلام میں عورتیں حدود وقیود میں گھری ہوئی ہیں، اور شریعت اسلامیہ نے ہرجگہ ان پر پہرہ لگا دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو پردے کا حکم دے کر ان کو ان تمام خطرات سے محفوظ کردیا ہے جو ان کی ذات سے وابستہ ہیں۔رات دن کے تجربات شاہد ہیں کہ عورتوں کی بے باکانہ چھل پہل مردوں کی جماعت میں ایک شورش پیدا کردیتی ہے، بن سنور کر بے پردہ نکلی ہوئی عورت، مرد کو مسحور کردیتی ہے، اور پھر بدقماش مرد جن کی معاشرے میں اکثریت رہتی ہے اس کی عصمت کو تار تار کرنے کی تگ ودو میں لگ جاتے ہیں۔

زنا وبدکاری کی ابتداء بدنظری ہی سے ہوتی ہے، تمام فواحش کی جڑ یہی ہے، اسلام نے سب سے پہلے اسی سوراخ کو بند کیا، ارشاد باری ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۞ (نور:۳۰)

(ایمان والوں سے کہہ دیجیے کہ ذرا اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کو چھپائے رکھیں اس میں ان کے لیے پاکیزگی ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کو اس کی خبر ہے۔)

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ آنکھوں کے فتنے سے یقینی طور پر اپنے آپ کو بچاؤ، کیوں کہ تمام فتنوں اور آفتوں کا بنیادی سبب یہی ہے۔

"ثم علیک و فقک اللہ و ایانا بحفظ العین فانها سبب کل فتنة و آفة" (منهاج العابدین، ص:۲۸)

اگر اس ہدایت پر عمل نہ ہوگا تو آنکھوں کے ذریعہ کسی فتنے میں پڑنے کا قوی اندیشہ ہے، جس کا نقصان یہ ہوگا کہ سکونِ قلب جاتا رہے گا اور دل وسوسوں کی آماجگاہ بن جائے گا۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ:

"الصبر علی غض البصر أیسر من الصبر علی ألم ما بعده".

(الجواب الکافی لابن القیم)

(آنکھ بند کرنا آسان ہے مگر اس کے بعد کی تکلیف پر صبر مشکل۔)

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس فتنے کی طرف اشارہ فرمایا:

"النظرة سهم مسموم من سهام ابلیس" (المستدرک للحاکم)

(نظر ابلیس کے تیروں میں سے ایک زہر آلود تیر ہے۔)

ایک لمبی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"العینان زناهما النظر و الأذنان زناهما الاستماع و اللسان زناها الکلام و الید زناها البطش و الرجل زناها الخطیٰ و القلب یهوي و یتمنی و یصدق ذلک الفرج و یکذبه." (مسلم)

(آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، کانوں کا زنا سننا ہے، زبان کا زنا بات کرنا ہے، ہاتھ کا زنا پکڑنا ہے، پیر کا زنا چلنا ہے، دل آرزو اور تمنا کرتا ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق اور

تکذیب کرتی ہے۔)

بعض اسلاف سے یہ منقول ہے:

"**النظر سهم سم الى القلب**". (ابن کثیر، ج:۲، ص:۲۸۲)

(نگاہ ایک زہریلا تیر ہے جو دل کو لگتا ہے اور اس کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔)

نظر کی حفاظت بہت ضروری ہے ورنہ اس سے بڑے بڑے فتنے پیدا ہو سکتے ہیں، قوم اور ملک کا امن و امان خطرے میں پڑ سکتا ہے، اخلاق و اعمال کی مٹی پلید ہو سکتی ہے اور عفت و عصمت دم توڑ سکتی ہے۔

اسلام نے صرحتاً جہاں مردوں کو نظر نیچی رکھنے کا حکم دیا وہیں عورتوں کو بھی فراموش نہیں کیا، مرد اور عورت دونوں کا خمیر ایک ہی ہے، عورت کی فطرت بھی شہوت سے اور اس کے دواعی سے خالی نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو بھی حکم دیا ہے:

''وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا'' (نور:۳۱)

(ایمان والیوں سے کہہ دو کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنی شہوت کی جگہوں کو تھامے رکھیں اور اپنی زیبائش نہ دکھلائیں مگر جو اُن میں سے کھلی چیز ہے۔)

شہوت کے معاملے میں جو حال مردوں کا ہے، کم و بیش وہی حال عورتوں کا بھی ہے، بلکہ ان کی نگاہ تو اور بھی فتنہ جگاتی ہے، جذبات میں عورتیں عموماً آگے ہوتی ہیں، اور جلد متأثر ہونا تو ان کا مستقل مرض ہے۔ اس لیے ان کو اپنی آنکھوں کی حفاظت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، چناں چہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خود عورت کے دل میں تو کوئی خطرہ نہیں گزرتا مگر ان کی بد احتیاطی سے کسی مرد کا سکونِ دل جاتا رہتا ہے اور وہ مرد اپنی غرض کے سلسلے میں اندھا بن جاتا ہے سینکڑوں جال بچھاتا ہے، کبھی کبھی زبردستی کسی معصوم کی عصمت دری کے در پے ہو جاتا ہے۔ آج کے زمانے میں تو اخباروں اور رسالوں میں اکثر خبریں چھپتی رہتی ہیں۔

قرآن کا مطالبہ ہے کہ عورتیں بغیر ضرورت گھر سے باہر نہ پھریں، جیسا کہ قرآن کی

اس سلسلے کی پہلی آیت ’’وَقَرْنَ فِي بُيُوْتِكُنَّ‘‘ ماقبل میں مذکور ہوچکی۔

ارشادنبوی ہے:

’’ان المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشيطان و أقرب ما تكون من وجه ربها و هي في قعر بيتها‘‘ (مسند البزار ج ۵، ص ۴۲۷)

(عورت چھپا کر رکھنے کی چیز ہے، جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی تاک جھانک میں رہتا ہے، وہ اپنے گھر کے گوشے میں رحمت الٰہی سے زیادہ قریب ہے۔)

اگر ضرورت سے ان کو نکلنا ہی پڑے تو نگاہیں پست رکھیں اور شہوت کے مقام سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں، جس کا حکم: ’’وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ‘‘ میں گزرا۔ پھر یہ نکلیں تو ستر چھپا کر باہر نکلیں اور آزاد عورت کا سارا بدن ستر ہے، بجز ہاتھ اور اوپری کپڑوں کے جس کا ذکر: ’’وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا‘‘ میں ہے۔ یا کسی سے ملنے جائیں تو اوپر برقعہ ڈال لیں اور بدن کا اتار چڑھاؤ ظاہر نہ ہونے دیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ’’وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ‘‘

(عورتیں اپنے اوپر برقعہ ڈال لیں اور چاہئے کہ اپنے گریبان پر دوپٹہ بھی ڈال لیں۔)

وقت ضرورت اگر عورت باہر نکلے تو کوئی ایسی حرکت نہ ہونے پائے جس سے زینت کا اظہار ہو، یا دوسروں کی توجہ اس کی طرف کھنچے، نہ ظاہری طور پر ایسی بات ہو نہ باطنی طور پر، بلکہ ظاہر و باطن پاک صاف ہو۔ باطن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’يعلم خائنة الأعين و ما تخفي الصدور‘‘

(اور وہ آنکھوں کی چوری اور دلوں کے بھید کو جانتا ہے۔)

اور ظاہر کے متعلق ہدایت فرمائی:

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾ . (نور)

(عورتیں اپنے پیر کو زمین پر نہ ماریں کہ ان کی مخفی زینت جان لی جائے، اور اے

ایمان والو! سب کے سب اللہ کی طرف توبہ کروتا کہ تم بھلائی پاؤ۔)

عورتیں عموماً پاؤں میں مختلف اور متعدد زیورات پہنا کرتی ہیں جن میں آواز پیدا ہوتی ہے جیسے گھونگرو وغیرہ۔اس طرح کے زیورات بالکل ممنوع ہیں،اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ جب زیورات کے اخفاء کا حکم ہے اور ان کی آواز کے متعلق احتیاط اور ممانعت کا حکم ہے تو جن اعضاء میں یہ زیورات پہنے جاتے ہیں ان کے اخفاء کا حکم تو بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

الحاصل مذہب اسلام جو ایک پاکیزہ اور صاف ستھرا معاشرہ وجود میں لانا چاہتا ہے،اپنے ماننے والوں کا اس بات کا پابند بنا تاہے کہ وہ معاشرے میں بے حیائی کو فروغ نہ پانے دیں اوراس میں سب سے اہم رول چوں کہ بے پردگی کا ہوتا ہے اس لیے اسلام عورتوں کو بلا ضرورت گھروں سے نکلنے کو منع کرتا ہے اور اگر ضرورت کے موقع پر نکلیں تو پابند کرتا ہے کہ باحجاب نکلیں تا کہ کسی بدنظر کی للچائی نظر اس پر نہ پڑے۔

اولاد کے نکاح میں جلدی کیجئے

نکاح کی ضرورت افادیت اور فضیلت سے کسے انکار۔ متعدد آیات قرآنی واحادیث نبویہ اس کی فضیلت پر ناطق ہیں، جن میں سے چند ایک یہاں پیش کی جارہی ہیں، ارشاد ربانی ہے:

''وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجاً وَّ ذُرِّيَّةً''

(الرعد:۳۸)

(اور ہم نے یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیویاں اور بچے بھی دیئے۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ رب العزت نے نکاح کو تمام نبیوں کی سنت قرار دیا ہے۔

ایک دوسری آیت میں اللہ رب العزت نے میاں بیوی کی محبت کو قدرت کی نشانی قرار دی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

''وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّ رَحْمَةً . . . الاية''(الروم:۲۱)

(اور اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تم سے تمہارے جوڑے بنائے تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو، اور تم میاں بیوی کے درمیان محبت و ہمدردی پیدا کی۔)

نیز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے نوجوانوں کی جماعت: تم میں سے جو شخص شادی کی طاقت رکھتا ہو (یعنی بیوی کے حقوق ادا کرسکتا ہو، اور اس کے نان ونفقہ کو برداشت کرسکتا ہو) وہ ضرور نکاح

کرے، اس لیے کہ یہ نگاہ کی حفاظت اور شرمگاہ کی پاکدامنی کا ذریعہ ہے۔(بخاری شریف)

حضرت محمد بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مسلمانو! نکاح کیا کرو۔ کیوں کہ میں تمہارے سبب سے اس بات میں دنیا کی اور قوموں سے سبقت لے جانا چاہتا ہوں کہ میری امت شمار میں ان سب سے زیادہ رہے۔ مسلمانو! راہبوں کی طرح مجرد نہ رہا کرو۔(بیہقی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ نوجوانو! تم میں سے جو نکاح کی ذمہ داریاں اٹھانے کی طاقت رکھتا ہو اسے نکاح کر لینا چاہئے۔ کیونکہ اس سے نگاہیں نیچی رہتی ہیں اور شرم گاہوں کی حفاظت ہوتی ہے اور جو نکاح کی ذمہ داریاں نہ اٹھا سکتا ہو اس کو چاہئے کہ شہوت کا زور توڑنے کے لئے روزے رکھے۔(متفق علیہ)

ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیر شادی شدہ مرد کو محتاج اور مسکین قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت ابو نجیح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا:

''محتاج ہے محتاج ہے وہ مرد جس کی بیوی نہ ہو، لوگوں نے عرض کیا اگر چہ وہ بہت مالدار ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں اگر چہ وہ بہت مالدار ہو۔ محتاج ہے محتاج ہے وہ عورت جس کا شوہر نہ ہو، لوگوں نے عرض کیا اگر چہ وہ بہت مالدار ہو؟ آپ نے ارشاد فرمایا ہاں اگر چہ وہ بہت مالدار ہو۔'' (رواہ رزین)

ابو نجیحح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں جو شخص نکاح کرنے کی وسعت رکھتا ہو پھر نکاح نہ کرے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔

(الترغیب والترہیب)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب بندہ نکاح کر لیتا ہے تو آدھا دین کامل کر لیتا ہے اب اس کو چاہئے کہ نصف دین میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے۔(الترغیب والترہیب)

حضرت ابوذر سے ایک طویل حدیث میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

حضرت عکاف رضی اللہ عنہ سے فرمایا اے عکاف کیا تیری بیوی ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا اور تو مال والا وسعت والا ہے؟ عرض کیا ہاں میں مال اور وسعت والا ہوں۔ آپ نے فرمایا تو اس حالت میں تو شیطان کے بھائیوں میں سے ہے، اگر تو نصاریٰ میں سے ہوتا تو ان کا راہب ہوتا۔ بلا شبہ نکاح کرنا ہمارا طریقہ ہے تم میں سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جو بے نکاح ہیں اور مرنے والوں میں سب سے بدتر وہ ہیں جو بے نکاح ہیں کیا تم شیطان سے لگاؤ رکھتے ہو؟ شیطان کے پاس عورتوں سے زیادہ کوئی ہتھیار نہیں۔ جو صالحین یعنی دینداروں میں کارگر ہو (یعنی عورتوں کے ذریعہ فتنہ میں مبتلا کرتا ہے) مگر جو لوگ نکاح کئے ہوئے ہیں یہ لوگ بالکل مطہر (پاکیزہ) اور فحش سے بَری ہیں، اور فرمایا اے عکاف تیرا بُرا ہو نکاح کر لے ورنہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگا۔ (جمع الفوائد)

قرآن کریم کی ان آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مذکورہ ارشادات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے انسان کی جنسی خواہش کو ایک فطری ضرورت تسلیم کیا ہے، اس خواہش کو اسلام نہ تو بالکل دبانے اور کچلنے کا حکم دیتا ہے اور نہ ہی مرد و عورت کو بے لگام آزاد رہنے کی اجازت دیتا ہے۔ بلکہ وہ نکاح کے ذریعہ ایک اچھی اور پاکیزہ زندگی کی تشکیل چاہتا ہے، جس میں نہ تو رہبانیت ہو اور نہ ہی جنسی آوارگی کی کوئی بو ہو، بلکہ ہر شخص شریعت کے احکام کی پیروی اور اللہ کی عبادت و اطاعت کے ساتھ، کسی نیک خاتون کو زندگی کا ہم سفر بنا کر پرسکون اور خوش گوار زندگی گذارے۔

الحاصل نکاح اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے دنیا اور دین دونوں کے کام اس سے درست ہو جاتے ہیں اور اس میں بہت سے فائدے اور بے انتہا مصلحتیں ہیں آدمی گناہ سے بچتا ہے، دل یکسو ہو جاتا ہے، نیت خراب اور ڈانواں ڈول نہیں رہتی، اور بہت سے دیگر دنیوی فوائد کے ساتھ اخروی ثواب بھی ہے۔ اس لیے نکاح ضرور کرنا چاہیے۔

آج جب کہ پورا معاشرہ، ٹی وی، ویڈیو، فلم، فحش ناول، شہوانی لیٹریچر اور

گندے سیریل کی وجہ سے اخلاقی تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا ہے۔جس کی وجہ سے خصوصاً نوجوان نسلوں میں جذباتی رجحان مسلسل بڑھتا ہی جا رہا ہے،اس پس منظر میں نکاح کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے،اوراس بات کی شدید ضرورت ہوگئی ہے کہ بالغ ہوجانے اور مناسب رشتہ مل جانے کے بعد لڑکے اور لڑکیوں کی شادی میں ہرگز دیر نہ کی جائے۔

لڑکے اور لڑکیاں جب بالغ ہوجائیں اور انھیں نکاح کی ضرورت محسوس ہونے لگے، پھر بھی ان کا نکاح نہ کیا جائے،تو یہ ترک نکاح بہت سے فتنوں کا سبب بن جاتا ہے، جوانی آنے کے بعد وساوس وخطرات کا ہجوم ہونے لگتا ہے، جو عبادات میں حلاوت وطمانیت کو بالکل ہی برباد کردیتا ہے ۔ بلکہ بعض مرتبہ توان وساوس وخطرات سے متاثر ہوکر بعض نوجوانوں سے اس کے مقتضاء پر عمل بھی سرزد ہوجاتا ہے، اور وہ بدنظری وزنا کے مرتکب ہوجاتے ہیں

شادی کی بہترین عمر یہ ہے کہ اگر مناسب رشتہ مل جائے تو بلوغ کے فورا بعد ہی کردی جائے،جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

”وابتلوا الیتامیٰ حتی اذا بلغوا النکاح“(القرآن)

(اور یتیموں کو آزمالیا کرو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں)۔

اس آیت کریمہ میں صاف اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نکاح کا پسندیدہ زمانہ بالغ ہوجانے کے بعد کا ہے۔یہی قرآن کریم کی تعلیم ہے کہ بالغ ہوجانے اور عقل کے پختہ ہوجانے کے بعد جلد سے جلد نکاح کر دینا چاہیے۔

بلا وجہ نکاح میں تاخیر کرنا ہرگز مناسب نہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح جس وقت کیا،اس وقت ان کی عمر ساڑھے پندرہ سال اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر اکیس سال تھی۔البتہ شادی کرنے میں اس بات کا خیال ضرور رکھیں کہ لڑکا نان ونفقہ کی ذمہ داری اور لڑکی گھر کی ذمہ داریوں کو نبھانے کی اہل ہوگئی ہو۔

والدین کو بچیوں اور بچوں کے نکاح کرنے کا تاکیدی حکم خود قرآن میں بھی ہے اور حدیث میں بھی ہے۔ارشاد باری تعالی ہے:

"فانکحوا الایامٰی منکم... الآیة"

(تم لوگ ایامی کا نکاح کردیا کرو)

''ایامی''ایم کی جمع ہے''ایم''ایسی لڑکی کو کہتے ہیں جس کا شوہر نہ ہو،خواہ باکرہ ہو یا ثیبہ،یعنی خواہ کنواری ہو یا بیاہی ہو پھر بیوہ ہوگئی ہو،اسی طرح اس مرد کو بھی ''ایم'' کہتے ہیں جس کے بیوی نہ ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''یا علی ثلاث لاتوخرها الصلوة اذا اتت، والجنازة اذا حضرت والایم اذا وجدت لها کفوا.(ترمذی)

(اے علی تین چیزوں میں تاخیر نہ کرو، ایک تو نماز جب اس کا وقت آجائے، دوسرے جنازہ میں جب وہ تیار ہوجائے،تیسرے بے نکاح لڑکے اور لڑکی کی شادی میں جب کہ جوڑ مل جائے۔)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

فی التوراة مکتوب من بلغت ابنته اثنتی عشرة سنة ولم یزوجها فاصابت اثما فاثم ذالک علیه.(البیهقی فی شعب الایمان)

(توارت میں لکھا ہوا تھا کہ جس کی لڑکی بارہ سال کی ہوگئی اور اس نے نکاح نہیں کیا پھر وہ کسی گناہ میں پھنس گئی تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہوگا)۔

حضرت ابوسعید اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اجمعین سے راویت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جس کی اولاد پیدا ہو،اس کو چاہئے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اچھی تعلیم دے،پھر جب وہ بالغ ہوجائے تو اس کا نکاح کردے۔اگر وہ بالغ ہوجائے اور اس کا نکاح نہ کرے پھر وہ کسی گناہ میں مبتلا ہوجائے تو اس کا گناہ (سبب کے درجہ میں) باپ پر بھی

ہوگا (اگر چہ مباشرت کے درجے میں خود اسی پر ہوگا)۔

ان آیات اور روایات سے معلوم ہوا کہ والدین اور اولیاء کی ذمہ داری ہے کہ بالغ ہونے کے بعد اگر مناسب رشتہ مل جائے اور لڑکا و لڑکی اپنی ذمہ داریوں کے نبھانے کے اہل ہوں تو ان کا فورا نکاح کر دینا چاہیے، اس میں تاخیر سے جہاں یہ خطرہ ہے کہ وہ کسی گناہ میں مبتلا ہو جائیں، وہیں یہ بھی ہے کہ والدین کی رسوائی اور ذلت کا سبب بنیں، نیز ان کی معصیت کا گناہ خواہ وہ زنا کا گناہ ہو یا بدنظری کا صرف انہیں پر نہیں ہوگا بلکہ والدین بھی آخرت میں جواب دہ ہوں گے۔ جیسا کہ آخر کی روایات سے معلوم ہوا۔

افسوس اس حوالے سے آج مسلمانوں میں بہت ہی غفلت پائی جارہی ہے کتنی ہی مسلمان بیٹیاں اور بہنیں ہیں کہ بیس بیس سال اور پچیس پچیس سال کی عمر کو پہنچ جاتی ہیں، ان کے سرپرست اور ذمہ داران کا نکاح نہیں کرتے ہیں۔ لڑکوں کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے کہ والدین ان کے نکاح کے تعلق سے بھی غیر ذمہ دارانہ برتاؤ رکھتے ہیں، اور ایک عمر گذر جانے کے بعد ہی ان کے رشتوں کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ جس کا انجام یہ ہورہا ہے کہ زنا کاری اور بدکاری عام ہوگئی ہے، ناجائز اولادیں پیدا ہورہی ہیں، لڑکے اور لڑکیاں پیار و محبت کر کے خود اپنا نکاح عدالتوں کے ذریعہ کرا رہے ہیں۔ بے شمار لڑکیاں مذہب اور غیر مذہب کی پرواہ کیے بغیر غیروں کے ساتھ بھاگ رہی ہیں، اور کتنی ہی لڑکیاں شادی سے پہلے ہی غیر محرموں سے دوستی کرنے، دل بہلانے اور وقتی دل لگی میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتیں۔ کہاں ہے غیرت اسلامی اور اسلامی تعلیمات پر عمل داری۔ فیا اسفا

ایک نقصان یہ بھی کہ بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کی جب وقت پر شادی نہیں ہوتی، تو پھر انہیں ایک دوسرے کے حسن پر غلط نگاہ ڈالنے کی لت پڑ جاتی ہے، دل و دماغ میں ہمیشہ عجیب سا انتشار رہتا ہے اور بدنظری ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے، جو ذریعہ بنتے ہیں زنا کاری و بدکاری میں مبتلا ہونے کا۔ حالاں کہ شریعت میں بدنظری کو آنکھوں کا زنا قرار دیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اجنبی کے حسن و جمال کا آنکھوں سے لطف لینا، اس

کی آواز سے کانوں کا لذت محسوس کرنا، اس کی باتوں سے لطف اٹھانا اور اس سے ملاقات کے لیے دلوں کا خواہش اور آرزو کرنا، سب کو زنا فرمایا ہے، جیسا کہ ابو داؤد شریف کے حوالے سے روایت مذکور ہو چکی۔

عمر کے ڈھلنے کے ساتھ صحت بھی خراب ہونے لگتی ہے، خصوصا جب کہ گندے خیالات اور اجنبی لڑکوں ولڑکیوں کا تصور دل ودماغ کو ہر وقت پراگندہ کیے رہیں، یہی وجہ ہے کہ جس قدر تاخیر سے شادی کا رجحان پنپ رہا ہے اسی قدر جریان، احتلام اور لیکوریا وغیرہ کی بیماریاں بڑھ رہی ہیں، جو جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے چہرے کی رونق، آنکھوں کی بینائی اور دماغ کی قوت کو چھین لیتی ہیں، جسم کمزور اور ناتواں ہوجاتا ہے، جس کے نتیجے میں بقول ایک ماہر حکیم: جوانی میں بڑھاپے کا مزہ لینے لگتے ہیں۔

شاید ہی آج کوئی ایسا خاندان ہو کہ جس میں ایک نہ ایک نوجوان لڑکی اپنی ڈھلتی ہوئی جوانی پر سسکیاں نہ لے رہی ہو، اور دل ہی دل میں اپنے والدین اور سرپرست پر لعن وطعن نہ کر رہی ہو، جب کہ اکثر والدین شرعی مجبوری کے بجائے لمبے چوڑے خواب، لمبی چوڑی ڈگریاں اور اونچی اونچی سروس والے شوہر کی تلاش میں رہتے ہیں۔

حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ بیٹی کی شادی جلدی کی جائے، مگر ہم کہتے ہیں ہماری بیٹی ذرا پڑھائی مکمل کر لے، ذرا ملازمت (نوکری) پر چلی جائے، ابھی تو اس کی عمر ہی کیا ہے؟ یہی بیس بائیس سال کی۔ انجام سے بے خبر ایسے والدین اپنی کنواری لڑکیوں کو بالغ ہوجانے کے بعد کئی کئی سال تک بٹھائے رکھتے ہیں اور محض شہرت کے سامان کے انتظار میں شادی نہیں کرتے، یہاں تک کہ بہت ساری جوان بیٹیوں کی جوانی اسی انتظار میں ڈھل جاتی ہے اور اندھے سرپرستوں کو کچھ نظر نہیں آتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ احادیث کے مطابق اگر ایسی لڑکیوں سے کوئی بھول ہوگئی تو گناہ میں کس کی پکڑ ہوگی؟۔ اگر کسی کو اللہ کی پکڑ کا خوف نہیں ہے تو کم از کم دنیا ہی کی عزت وآبرو ہی کے لیے تاخیر سے شادی نہ کرے۔

والدین اور اولیاء کی طرف سے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی میں تاخیر کے بہت سے

اسباب ہیں، جن میں سے ایک انتہائی حسین وجمیل لڑکی کی تلاش ہے کہ والدین اپنے بیٹوں کے لیے ایسا حسن تلاش کرتے ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن کو بھی پیچھے چھوڑ دے، ایسی خوبصورتی جس کے سامنے سارے چراغ بجھ جائیں، یہی وجہ ہے کہ مائیں اپنے بیٹوں کے لیے ایک گھر کے بعد دوسرا گھر تلاش کرتے کرتے لاتعداد لڑکیاں دیکھتی ہیں، اوران سب کوانکار کردیتی ہیں، ظاہر ہے کہ جہاں مناسب رنگت والی لڑکی بھی نظر میں نہ بچ سکی تو ذرا دبی ہوئی رنگ والی کہاں پسند آسکتی ہے۔ لیکن لڑکوں کی مائیں اور بہنیں آسمانی حور کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتی ہیں۔

تاخیر سے شادی کی ایک بڑی وجہ ہمارے سماج اور معاشرے میں جہیز کی لعنت ہے، لڑکی والوں کے لیے جہیز کے طور پر کار، کوٹھی، زیورات، اور فرنیچر کی تیاری میں اچھا خاصا وقت چاہئے، کیوں کہ غریب اور درمیانی گھرانے تو بڑی مشکل سے گذارہ کررہے ہیں، وہ اتنا جہیز کہاں سے دیں گے؟ جب کہ اکثر لڑکے والے اسی چکر میں رہتے ہیں کہ انہیں امیر اور مالدار گھرانہ ملے، یہی وجہ ہے کہ غریب لڑکیوں کی عمر ڈھلتی جارہی ہے۔

جب کہ لڑکے والوں کی طرف سے تاخیر کی وجہ لڑکی کے لباس اور زیورات کی تیاری، دعوتِ ولیمہ کا انتظام اور شادی میں آنے والے تمام رشتہ داروں اور دوست واحباب کا خرچ برداشت کرنے کی رقم اکٹھا نہ ہونا ہے، کیوں کہ ہر شخص یہ سوچ کر پریشان ہے کہ سیکڑوں لوگوں کی دعوت کھا رکھی ہے، اگر ان تمام لوگوں کو نہ بلایا تو لوگ کیا کہیں گے۔ حالاں کہ تاخیر سے شادی کی وجہ سے اولاد اگر کوئی گناہ کر بیٹھے تو اللہ اور اس کے رسول کیا کہیں گے؟ یہ زیادہ سوچنے کا مقام ہے۔ اس لیے بہر حال سادے انداز میں شادی کردینی چاہیے، بلاوجہ تاخیر نقصان دہ ہے۔ اگر اسلامی تعلیمات وہدایات کو پیش نظر رکھا جائے تو ان سب پریشانیوں سے بچا جاسکتا ہے اور معمولی خرچ سے عمدہ شادی کی جاسکتی ہے۔

جہیز کی لعنت سے معاشرے کو پاک کیجئے

شادی میں جہیز دینے کی رسم ہندوستانی مسلمانوں میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، حالاں کہ جہیز کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ رسم یقینی طور پر غیر مسلموں سے آئی ہے، ہندو لوگ بیٹیوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیتے، اس کی تلافی کے لیے ان کے یہاں یہ رواج ہے کہ شادی کے موقع پر لڑکی کو زیادہ سے زیادہ مال و دولت دیا جائے، چنانچہ وہ جہیز کے نام پر بیٹی کو اپنی دولت کا ایک حصہ دینے کی کوشش کرتے ہیں، اسی غیر اسلامی رسم کی تقلید آج مسلمان بھی کر رہے ہیں۔

جہیز نے مسلم معاشرے کو ہلاک و برباد اور اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے، ہزاروں بسے بسائے گھروں کو تباہ و برباد کر دیا ہے، عورتوں کی نیلامی ہونے لگی ہے، نوجوان لڑکے بازاری ساز و سامان کی طرح مہنگی سے مہنگی قیمت پر بکنے لگے ہیں، معصوم لڑکیوں کے ارمانوں کا خون ہونے لگا ہے، غریب گھرانے کی بچیوں پر خدا کی زمین اپنی وسعت اور کشادگی کے باوجود تنگ ہوگئی ہے، ان کی پاکیزہ تمناؤں اور آرزؤں کا جنازہ نکل گیا ہے، غریب والدین کی نیند حرام ہوگئی ہیں، ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھن گئی ہے، لڑکیاں پیدا ہوتے ہی ماں باپ ہنسنا بھول جاتے ہیں، نہ جانے کتنی لڑکیاں اپنے غریب ماں باپ کی چوکھٹ پر خون کے آنسو بہانے پر مجبور ہوگئیں ہیں، اور پورے ملک میں ہر طرف چیخ و پکار، آہ و بکا اور رونے کا سماں بندھ گیا ہے، انسانیت بلبلا رہی ہے، معاشرہ ٹوٹ رہا ہے، لیکن خواہشات نفس کے بندے ہیں کہ اس رسم کو ختم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

یہی وہ جہیز ہے جس کی بدولت کتنی معصوم لڑکیوں نے خودکشی (حرام موت) کو سکون

وراحت کا سامان بنالیا اور کتنی ہی لڑکیوں کے غریب والدین نے خودکشی کر لی، صرف اس وجہ سے کہ ان کے پاس بھکاری داماد کی جہیز کی مانگ پوری کرنے کی وسعت وگنجائش نہیں ہے، اسی جہیز کی وجہ سے سیکڑوں لڑکیاں آگ کے انگارے میں بے دردی کے ساتھ جلا دی گئیں، بے شمار دولہنوں کے نازک جسم پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی، یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے لڑکیوں کی پیدائش کو عیب سمجھا جانے لگا، جس عورت کو صرف لڑکیاں ہی ہوں اسے بانجھ اور منحوس سمجھا جانے لگا، اور طلاق دے کر بیوگی کی زندگی گذارنے پر مجبور کیا گیا۔ لڑکیوں کے پیدا ہوتے ہی انتہائی بے رحمی کے ساتھ اپنی ہی اولاد کو والدین اپنے ہی ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارنے لگے، اسی جہیز سے گھبرا کر ماں کے پیٹ میں لڑکی کا پتہ چلتے ہی حمل کو گرایا جانے لگا۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

اسلام میں لڑکی کو وراثت کا باقاعدہ حصہ دار بنایا گیا ہے۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں نے لڑکیوں کو ان کے واجبی حق سے محروم کر رکھا ہے، حالاں کہ والدین کے چھوڑے ہوئے مال پر تنہا لڑکوں کا قبضہ کر لینا اور لڑکیوں کو ان کے حق سے محروم رکھنا، شریعت کے اعتبار سے سراسر ظلم، غصب، ناانصافی، اور کبیرہ گناہ ہے۔

لڑکیوں کو میراث سے محروم رکھنے کا رواج اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اکثر خواتین (عورتیں) اپنا حق میراث مانگنے میں حیا اور حجاب محسوس کرتی ہیں، اور اگر کوئی لڑکی اپنا حق مانگ بھی لے تو دوسرے رشتہ دار اسے شرم دلاتے ہیں، بھائی ایسی بہنوں سے رشتہ ختم کر لیتا ہے۔ ان کے یہاں آنا جانا بند کر دیتا ہے، اور خاندان میں اس کو بدنام کیا جاتا ہے، حالاں کہ یہ سراسر ناسمجھی کی بات ہے، حصۂ میراث ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں دیتا بلکہ یہ تو ایک خدائی عطیہ ہے جس میں کسی کو حق تلفی کی اجازت نہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ شریعت نے جس بات کو منع کیا ہے یعنی ''جہیز'' وغیرہ اس کا تو اہتمام کیا ہے، اور جس چیز کا شریعت نے حکم دیا ہے یعنی (حقِ میراث) اس سے لڑکیوں

کومحروم کیا جاتا ہے، حالاں کہ اگر بجائے جہیز کے لڑکیوں کو ان کا حق دے دیا جائے، تو ایک ہی وقت میں دو کام ہو جائیں گے، لڑکیاں خالی ہاتھ رخصت بھی نہیں ہوں گی اور ایک واجب بھی ادا ہو جائے گا۔

بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم نے لڑکی اور بہن کی شادی میں داماد اور بہنوئی کو لاکھوں روپئے نقد اور بے پناہ جہیز کا سامان دے دیا تو اب ان کا حقِ میراث کہاں باقی رہا؟ لہٰذا وہ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ جہیز کا سامان اور پیسہ میراث کا عوض اور بدل ہے، لہٰذا باپ کے مرنے کے بعد باپ کی میراث میں انہیں اب کوئی حصہ نہیں ملنا چاہیے۔ یہ خیال قطعاً غلط اور باطل ہے، کیوں کہ جہیز حقِ میراث کا بدل ہرگز نہیں بن سکتا۔ جہیز کا ساز وسامان دینے کے باوجود بھی ان کا حق بدستور باقی رہتا ہے، اس لیے کہ جہیز میں جو سامان دیا جاتا ہے، اس کی حیثیت ہدیہ اور تحفہ کی ہے، جب کہ میراث والدین کی طرف سے ملنے والا لڑکیوں کا واجبی حق ہے، جو ان کی وفات کے بعد واجب ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ایسا حق ہے کہ جس سے محروم کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔

اس موقعہ پر ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی مناسب ہے، وہ یہ کہ بعض حضرات سمجھتے ہیں کہ جہیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے، کیوں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کا نکاح کیا تو ان کو اپنے پاس سے جہیز بھی عطا کیا۔

اس قسم کی بات دراصل بہت بڑی غلطی ہے۔ اور اگر اس کو جہیز مان بھی لیا جائے تو ساری دنیا میں کوئی ایک مسلمان بھی نہیں جو اپنی لڑکی کو یہ پیغمبرانہ جہیز دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو جو سامان دیا تھا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی جہیز نہیں بلکہ انتہائی معمولی قسم کا چند ضروری سامان تھا، حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ کو رخصتی کے وقت جو سامان دیا اس میں ایک چادر، ایک مشکیزہ اور ایک چمڑے کا تکیہ تھا، جس میں اذخر (ایک قسم کی گھاس) کا بھراؤ تھا۔

یہ سامان آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیوں دیا اور کیسے دیا اس کا جاننا بھی بہت ضروری ہے،

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ چچا زاد بھائی ہونے کے ساتھ بچپن ہی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پر اسلام قبول کیے، بلکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کا شرف آپ ہی کو حاصل ہے، آپ ہر وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت ہی میں رہتے تھے، نیز ابھی کم عمر ہی تھے کہ آپ کے والد ابوطالب کا انتقال ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے بسبب چچا زاد ہونے حضرت علی رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت میں بھی آ گئے، اور بیٹے کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت میں رہنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی کو اپنے ساتھ رکھتے ان کی ضرورتوں کی تکمیل کرتے، اور ہر طرح کی دیکھ ریکھ کرتے، یہاں تک کہ جب حضرت علیؓ جوان ہو گئے تو اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کے ساتھ ان کا نکاح فرما دیا۔

جب رخصتی کا وقت آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ اے علی! کھانے پینے، رہنے سہنے کا کوئی انتظام بھی ہے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا جی نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا تمہارے پاس کوئی سامان ہے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میرے پاس ایک گھوڑا اور ایک زرہ موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ گھوڑا تو تمہارے لیے ضرورت کی بہت اہم چیز ہے، البتہ اپنی زرہ بیچ کر اس کی قیمت لے آؤ، حضرت علیؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھوں چار سو اسی درہم میں اپنی زرہ بیچ دی اور قیمت لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رقم میں سے کچھ حضرت بلالؓ اور حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ کو دیکر عطر اور خوشبو لانے کے لیے ارشاد فرمایا، اور بقیہ رقم گھریلو ضروریات کے انتظام کے لیے حضرت بلالؓ کو عنایت کی۔ (زرقانی علی المواہب)

لہٰذا اس واقعہ سے جہیز کا جواز ثابت کرنا قطعی درست نہیں، کیوں کہ اگر حضرت فاطمہؓ کو دیئے گئے سامان کو جہیز مان لیا جائے تو سوال اٹھتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چار بیٹیاں تھیں کسی بیٹی کو رخصتی کے وقت کوئی سامان نہیں دیا۔ کیا وہ بیٹیاں نہیں تھیں؟ اور کیا

انہیں یہ حق نہیں پہنچتا تھا؟ جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خود ارشاد ہے:

"سوّوبین اولادکم"

(اپنی اولاد کے درمیان برابری کا برتاؤ رکھو)۔

یہ بھی واضح رہے کہ لڑکی بہرحال آپ کی بیٹی ہے، ایسے ہی لڑکا (داماد) بھی اب آپ کا بیٹا ہی ہوگیا ہے، اس لیے اگر ان کے ساتھ احسان وسلوک کرنا چاہیں اور کچھ دینا چاہیں اور یہ رسم کی صورت سے نہ ہو تو مضائقہ نہیں، اس کی صورت یہ ہے کہ تقریب کے موقع پر نہ دے، اس وقت مؤخر کردے، بعد میں کسی مناسب موقعہ سے دیدے جب کہ توقع بھی ختم ہوگئی ہو۔ بلاتوقع کے اگر دو روپئے بھی ملتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے، محبت بڑھتی ہے اور دل کی گہرائی سے مسرت ہوتی ہے، طبیعت اندر سے کھل جاتی ہے اور اگر رسم کے طور پر دیا تو صرف انتظار کی تکلیف ختم ہوگئی، لیکن رسم کی پابندی کی وجہ سے گنہگار ہوگا، اور ان بہت سی بچیوں کی حق تلفی کا مرتکب ہوگا، جن کے والدین اپنی بچیوں یا دامادوں کو مال دینے پر قادر نہیں ہیں۔

طلاق کو کھلونا نہ سمجھئے

نکاح ایک ایسا بندھن اور عہد ہے، جو پوری زندگی کی رفاقت، غم گساری اور ہم نشینی کے لیے ہوتا ہے، جہاں تک ممکن ہو، اس بندھن کو ٹوٹنے سے بچایا جائے اور عہد کی تکمیل کی جائے۔ لیکن اس حقیقت کا بھی انکار ممکن نہیں کہ ہر انسان اور ہر فرد بشر کا مزاج الگ ہے، ہر ایک کے سوچنے کا انداز اور رہنے سہنے کا طرز جدا ہے، بعض لوگوں کا مزاج ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی طبیعت کے خلاف کسی بھی بات کو برداشت ہی نہیں کر پاتے، اور معمولی معمولی باتوں پر تکرار اور جھگڑا شروع کر دیتے ہیں، یہ مزاج کسی عورت کا بھی ہو سکتا ہے اور کسی مرد کا بھی۔ اسی لیے نکاح کرتے وقت اولیاء کو اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہم مزاج لڑکے اور لڑکی کا آپس میں رشتہ کریں، ورنہ بعد میں مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے کسی کا رشتہ ایسا ہو ہی گیا کہ میاں بیوی کا مزاج ہم آہنگ نہیں ہے، اور دونوں ایک دوسرے کو سامان راحت و سکون کی بجائے عذاب اور مصیبت محسوس کر رہے ہیں، اور آپسی تعلقات کو بحال رکھنے کی تمام تدابیر ختم ہو چکی ہیں تو اب اس صورت میں دونوں کے درمیان جدائی کرا دینا ہی بہتر ہے، تاکہ دوسرا نکاح کر کے دونوں سکون کی زندگی گذار سکیں۔ اسی جدائی کا نام طلاق ہے۔ جس کی اجازت شریعت نے بدرجۂ مجبوری عطا کی ہے اور ایک ایسا جواز قرار دیا ہے جسے صرف اس وقت اختیار کیا جا سکتا ہے جب صلح کی تمام تدبیریں ناکام ہو جائیں اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے کہ دونوں میاں بیوی علاحدگی اختیار کر لیں۔

اس جواز کی کیا حیثیت ہے، اس کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ آں حضر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ''**ابغض المباحات**'' کہا ہے، یعنی ایسا امر مباح جو اللہ تعالیٰ کے ہاں سخت ناگوار

اور انتہائی ناپسندیدہ ہے۔

طلاق ایسی فضا میں دینا چاہیے جس میں اس کو ایذا بالباطل سے تعبیر نہ کیا جائے۔ قرآن حکیم میں ہے:

''فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا'' (النساء: ۳۴)

(اور اگر فرمانبرداری اختیار کرلیں تو ایذا دہی کا بہانہ مت ڈھونڈو۔)

اس کا مطلب یہ ہے کہ طلاق کے لیے خواہ مخواہ اسباب و وجوہ تلاش نہیں کرنا چاہیے بلکہ کوشش کرنا چاہیے کہ حالات حتی الامکان سازگار رہیں اور میاں بیوی میں محبت و حسنِ سلوک کا ماحول ہمیشہ قائم رہے۔ پھر اگر علیحدگی ناگزیر ہوجائے اور علاحدہ ہوجانے ہی میں دونوں کا بھلا اور راحت ہے، تب طلاق کی نوبت آنا چاہیے، ورنہ بغیر کسی عذر شرعی و طبعی کے طلاق دینا ایذائے باطل کے تحت شمار ہوگا۔

پھر جس طرح مرد کے لیے ضروری ہے کہ بغیر حالات کی انتہائی ناسازگاری کے طلاق نہ دے، اسی طرح عورت کو بھی چاہیے کہ خواہ مخواہ طلاق کا مطالبہ کرکے اپنی دنیا و آخرت خراب نہ کرے۔ حدیث میں ہے:

"ایما امرأة سألت زوجها طلاقها من غیر مابأس لم ترح رائحة الجنة."

(جو عورت بھی اپنے خاوند سے بغیر کسی تکلیف کے اور حقیقی شکایت کے طلاق کا مطالبہ کرے گی وہ جنت کی بو بھی نہیں سونگھ پائے گی۔)

واضح رہے کہ طلاق کی غرض صرف یہ ہے کہ میاں بیوی کسی معقول وجہ سے ازدواجی رشتوں کو قائم نہیں رکھنا چاہتے، اس لیے ان میں اب جدائی ہو رہی ہے تاکہ جو جہاں چاہے نکاح کرے، یہ بات بہر حال معاملہ کی ہے، اس لیے اس کو نہایت خوش اسلوبی سے معاملہ ہی کی سطح پر ادا کرنا چاہیے، بدمزگی، بدگمانی اور ایسی فضا پیدا نہ ہونے دینا چاہئے کہ جس سے ان دونوں میں کسی ایک کی شہرت خراب ہو، عزت پر داغ آئے

اور مزید تلخیاں پیدا ہوں۔اسی لیے شوہر کو چاہیے کہ ایسے وقت طلاق دے،جس میں عورت کو زیادہ عدت نہ گزارنی پڑے،اسی طرح ایک طلاق دے،تاکہ آئندہ اگر اتفاق کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو رجوع کا اختیار باقی رہے۔

عورت چوں کہ جذباتی اور کم فہم ہوتی ہے،حالات سے جلد متاثر ہو جاتی ہے،اس کے بالمقابل مرد معاملہ فہم،دور اندیش اور حالات سے مقابلہ کرنے والا ہوتا ہے،اس لیے شریعت اسلامیہ نے طلاق کا حق صرف مرد کو دیا ہے،کہ بہت سوچ سمجھ کر وہ اپنے اس اختیار کو استعمال کرے۔عورت کو اگر اختیار دے دیا جاتا تو معمولی معمولی باتوں سے متاثر ہو کر وہ اپنے اس اختیار کو استعمال کرنے لگتی،اور نکاح وطلاق جو زندگی کے انتہائی اہم امور ہیں مزاق بن کر رہ جاتے۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اسلام نے عورت کو مرد کے ہاتھوں میں مجبور محض بنا دیا ہے،اب وہ جس طرح چاہے اس پر ظلم وزیادتی کے پہاڑ توڑتا رہے اور وہ بیچاری پوری زندگی سسکتی اور ظلم سہتی رہے،اولاً شریعت نے اسے خلع کا اختیار دیا ہے کہ کچھ مال وغیرہ دے کر شوہر کو طلاق پر راضی کر لے،لیکن اگر وہ اس پر بھی تیار نہیں ہوتا،اور ظلم وزیادتی سے بھی باز نہیں آتا تو ثانیاً اس کو اختیار ہے کہ دار القضاء میں قاضی کے یہاں اپنے معاملے کو پیش کر دے،قاضی معاملے کی تحقیق کرے گا اور اگر واقعتاً شوہر ظالم ہے تو اسے مجبور کرے گا کہ وہ طلاق دیدے،اگر اس صورت میں بھی وہ طلاق نہیں دے گا،تو قاضی کو اختیار ہے کہ نکاح فسخ کر کے عورت کو آزاد کر دے اور اسے دوسرا نکاح کرنے کا اختیار دیدے۔

وہ نبیادی مسائل جو طلاق کے نتیجہ میں رونما ہوتے ہیں ان میں سب سے اھم جو ماں باپ دونوں کے لیے پریشان کن ہوتا ہے وہ ہے بچے کی تربیت اور ماں باپ کے اختلاف کا بچے کے اوپر رونماں ہونے والا اثر کہ جس کے نتیجے میں بچہ دونوں کی نگرانی اور شفقت سے محروم ہو جاتا ہے۔

بلاشبہ بچہ جب دنیا میں آنکھ کھولتا ہے اور اس پر شفقت کرنے والی ماں اور اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنے اور ضروریات پوری کرنے والا باپ نہیں ہوتا تو وہ لازمی طور سے جرائم اور برائیوں کی طرف مائل ہوجاتا ہے اور اس میں فساد وانحراف نشوونما پاتا ہتا ہے، یہ صورت حال اس وقت اور زیادہ خراب ہوجاتی ہے جب مطلقہ عورت دوسرے خاوند سے شادی کرلیتی ہے تو عام طور سے اولاد خراب اور ضائع ہوجاتی ہے۔

طلاق کے بعد اس پریشانی کو ماں کی غربت اور پیچیدہ بنادیتی ہے اس لئے کہ ایسی صورت حال میں مطلقہ عورت کام کاج کے لئے گھر سے نکلنے پر مجبور ہوتی ہے، لہٰذا وہ گھر کو چھوڑ کر کام کرنے چلی جاتی ہے اور چھوٹے بچے بے یارومددگار ادھر ادھر پھرتے ہیں، حوادثات ایام اور شب وروز کے فتنے ان کو کھلونا بنا لیتے ہیں، نہ کوئی ان کا دیکھ بھال کرنے والا ہوتا ہے نہ نگہداشت کرنے والا، اب آپ ہی بتائیے کہ ایسی اولاد سے آپ کیا توقع رکھتے ہیں جنہیں نہ باپ کی محبت میسر ہو نہ اس کی نگرانی ونگہداشت، نہ ماں کا پیار ملا نہ اس کی توجہ اور ہمدردیاں۔

ہم ان سے ایسی صورت حال میں کیا توقع کرسکتے ہیں جب وہ اپنے پاس پیٹ بھر کر روٹی، بدن ڈھانپنے کو کپڑا اور سر چھپانے اور راحت وآرام کے لیے جھونپڑا بھی نہیں پاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی صورت میں ہم ان سے آوارگی اور خراب ہونے کی توقع کرسکتے ہیں اور جرائم اور آوارگی سے بچنے کی اسی سے امید کرسکتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اور ایسے لوگ درحقیقت کم ہی ملتے ہیں۔ اپنے بنیادی احکامات میں میاں بیوی میں سے ہر ایک کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے اپنے فرائض وواجبات کو پورا کرے اور ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرے، تاکہ ایسی صورت حال پیدا نہ ہو جس کا انجام آخر کار برا اور قابل ملامت ہو۔

اس لئے شریعت کا حکم ہے کہ طلاق سے پہلے طلاق سے بچنے کی تمام تدابیر اختیار کی جائیں، اور پوری کوشش کی جائے کہ طلاق نہ دینی پڑے، جس کی ترتیب اس طرح ہے:

۱-وعظ ونصیحت کرنا اور سمجھانا تا کہ اس آیت کریمہ پرعمل ہو جائے: ”وذکر فإن الذکریٰ تنفع المؤمنین“

(نصیحت کرتے رہیے اس لیے کہ نصیحت کرنا مومنوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔)

۲-الگ بستر ے پر سونا، یہ ایک نفسیاتی سزا ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کے ذریعے سے صحیح راستہ پر آجائے۔

۳-کسی تیسرے آدمی کو فیصل بنا لیا جائے اور وہ اس طرح کہ میاں بیوی کے خاندان والوں میں سے متعدل مزاج عقل مند سمجھ دار لوگوں کو بیچ میں ڈال دیا جائے، جو میاں بیوی کو درپیش مشکلات کی تحقیق کریں اور پھران دونوں میں دوبارہ اتفاق ویگانگت اور اتحاد پیدا کرنے کی عملی تجاویز وحل پیش کریں، ہوسکتا ہے کہ یہ حل اور تجویز مقصد حاصل کرنے میں مدد دیں اور طلاق سے بچالیں۔

ان مراحل سے گزرنے اوران تدابیر پرعمل کرنے کے بعد بھی اگر اتفاق ناممکن ہوتو مرد کو چاہئے کہ عورت کو پاکی (غیرحیض) کے ایسے زمانے میں ایک طلاق دے جس میں اس سے ہم بستری نہ کی ہو، تاکہ پہلی طلاق دینے کے بعد بھی ازدواجی زندگی دوبارہ لوٹنے کی گنجائش باقی رہے۔

واضح رہے کہ بلاشبہ شریعت نے بحالت مجبوری طلاق کی اجازت دی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ بھی ہے، اس لیے اولاً تو یہ کوشش ہو کہ اس مرحلے تک ہرگز ہرگز بات نہ پہنچے اور کبھی حالات کا رخ اس جانب ہی مڑ چلا ہو کہ سوائے اس کے اور کوئی راستہ ہی نہ ہوتو جلد بازی یا جوش سے کوئی قدم نہ اٹھایا جائے، بلکہ علماء اور مفتی صاحبان سے ہر ہر مرحلے کا شرعی حکم پوچھ کر عمل کیا جائے۔ وباللہ التوفیق

✲ ✲ ✲

TEHQIQAT-E-SHARIYA ACADEMY
Mohalla Ibrahim Pura (Aal Kalan) Shamli Road
Kairana, Distt. Shamli (U.P.) INDIA, Pin. 247774
Mob. 9319530768, 9359602830